ہندوستان کی شرعی حیثیت

ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی

خسرو فاؤنڈیشن، نئی دہلی

© جملہ حقوق بحقِ خسرو فاؤنڈیشن محفوظ ہیں۔

Hindustan Ki Sharyi Haisiyat

Dr. Zafar Darik Qasmi

نام کتاب	:	ہندوستان کی شرعی حیثیت
مصنف	:	ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی
صفحات	:	236
اشاعت	:	2021
قیمت	:	-/250 روپے
پرنٹر	:	الفا آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
ناشر	:	خسرو فاؤنڈیشن، ڈی-319، ڈیفینس کالونی، نئی دہلی۔110024

ملنے کا پتہ

FBD
باہتمام: ناصر خان

فرید بکڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ
FARID BOOK DEPOT(Pvt.)Ltd.
Corp. Off : 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, N. Delhi-2
Ph : 011-23289786, 011-23289159, 011-23278954, 011-23279998
NASIR KHAN : +91-9250963868 Mob : +919560870828
E-mail : faridbookcorner@gmail.com Whatsapp : +91-9717968328

فہرست مضامین

تقدیم	6
پیش لفظ	12
باب اول:- ہندوستان کا مذہبی، سماجی اور سیاسی نظام	16-55
ہندوستان کی فضیلت	17
ہندومت اور مسلمان	22
ہندو جوگی اور مسلمان صوفی	34
ہندو دیوتاؤں کا احترام	37
مسلم عہد حکومت میں ہندو لٹریچر کا فروغ	41
ہندو شعراء کا احترام	48
ہندوستان کا قدیم سیاسی نظام	50
ہندوستان کے قدیم حکماء کا فلسفہ	52
خصائل ورسوم	53
باب دوم:- ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد و یکجہتی کی روایات	56-96
ہندوؤں کا مسلمانوں سے مشفقانہ برتاؤ	57
مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ حسن سلوک	62
بھگتی تحریک	64
مسلم حکمرانوں کا طریقۂ حکومت	66
مسلم دورِ حکومت میں ہندو احیائی تحریکیں	69
ہندو مسلم تعلقات کی دوسری جہات	72
مشترکہ تہذیب اور اس کی قدریں	79

مشترک سماجی قدریں	82
مشترکہ ثقافت اور زبانیں	85
تعمیرات میں ہندو مسلم اثرات	88
صوفیاء اور مشترکہ تہذیب	92
تصوف پر ہندوستانی تہذیب کا اثر	94
باب سوم:- سیکولرزم، حب الوطنی (نیشنلزم) مسلمان اور ہندوستان	97-148
سیکولرزم کا مفہوم	98
سیکولرزم کا مثبت پہلو اور ہندوستان	104
مسلمان اور ہندوستانی سیکولرزم	112
آئین ہند اور مسلم اقلیت	114
ہندوستان میں اقلیات	117
آزادی کا حق	117
مساوات کا حق	118
فکر و عقیدہ کی آزادی کا حق	118
اقلیتی ادارے	119
حب الوطنی، (نیشنلزم) اور مسلمان	121
نیشن یا قومیت	122
نیشنلزم اور مفکرین اسلام	125
حب الوطنی قرآن وسنت کے تناظر میں	134
باب چہارم:- ہندوستان کی شرعی حیثیت: جدید و قدیم آراء کی روشنی میں	**149-224**

تاریخی پس منظر	150
ہندوستان کی مذہبی حیثیت	151
ہندوستان میں مسلمانوں کے اولین نقوش	152
ہندوستان کی تعمیر وترقی میں مسلمانوں کا کردار	155
ہندوستان میں انگریزوں کی آمد	162
سماجی اقدار پر حملہ	164
معاشی واقتصادی اقدار پر حملہ	167
مذہبی وتہذیبی اقدار پر حملہ	171
آزادی سے قبل ہندوستان کی شرعی حیثیت	180
آزاد ہندوستان کی شرعی حیثیت	194
مشترک سماج اور شرعی احکام	205
تکثیری سماج میں احترام انسانیت	205
تکثیری معاشرے میں عزت وآبرو کی حفاظت	208
تکثیری سماج میں معاشی ضروریات کی تکمیل	210
تکثیری سماج اور تحفظ ملکیت	212
تکثیری سماج اور شخصی آزادی	212
تکثیری سماج اور عدل وانصاف	213
تکثیری سماج میں ادیان کا احترام	216
تکثیری سماج میں عبادت گاہوں کا احترام	222
کتابیات	225
خسرو فاؤنڈیشن: ایک نئی پہل	233

تقدیم

یہ حقیقت مسلم ہے کہ انسانیت کی بنیاد پر رشتوں اور تعلقات کو فروغ دینا آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ تاریخ شاہد ہے، جن قوموں نے انسانی حقوق اور باہمی اعتماد وارتباط پر اخلاص سے عمل کیا ہے وہ قومیں سماجی اور دیگر تمام شعبوں میں خوشحال رہی ہیں۔ ان کی تاریخ وتہذیب، تمدن وثقافت اور افکار ونظریات کو دیگر اقوام احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ البتہ جب بھی معاشروں میں انسانی رشتوں اور اس کے تقاضوں میں اضمحلال یا کھٹاس واقع ہوئی ہے تو نہ صرف وہ معاشرے تباہی کے دہانے پر جا پہنچے ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ ان کی اہمیت وفضیلت اور وقعت وتوقیر بھی پامال ہو جاتی ہے۔ ایسے افراد، خاندان، معاشرے اور قومیں بہت دن تک زندہ نہیں رہ پاتے ہیں۔ لہٰذا سماجی فلاح و بہبود اور بہتر مستقبل کی تعمیر وترقی کے لئے باہمی اخوت و رواداری جیسی مقدس قدروں کو پروان چڑھانا ہوگا تا کہ کسی بھی طرح انسانیت کی بنیاد پر تعمیر کیے گئے رشتوں کو مخدوش و مجروح نہ کیا جا سکے۔ جب ہم ملک کی تاریخ وتہذیب پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت طشت از بام ہوتی ہے کہ وطن عزیز میں قومی ہم آہنگی اور باہمی رکھ رکھاؤ کی روایت بہت قدیم ہے۔ بلا تعصب ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آنا، خوشی اور غمی کے موقعوں میں باہم مل کر رہنا ہندوستان کی مٹی میں شامل ہے اور رہے گا۔ یوں تو ہندوستان ادیان و مذاہب، افکار وعقائد، متنوع زبانوں کا مرکز ومحور ہے، اس کے باوجود عام طور پر کسی کو کسی کے نہ دین ودھرم سے شکایت ہے نہ کوئی کسی

کی تہذیب وزبان پر کیچڑ اچھالتا ہے۔ چنانچہ ہم کہ سکتے ہیں کہ یہ وہ سرزمین ہے جس نے بے شمار تہذیبوں اور ثقافتوں نیز خیالات کو جنم تو دیا اور ہر ایک تہذیب وثقافت کے حاملین بھی موجود ہیں، مگر کبھی بھی ان اسباب ووجوہ کی بنا پر کوئی کسی سے بدظن نہیں ہوا ہے۔ لیکن اِدھر کچھ عرصے سے کچھ غلط فہمیوں کو عام کرنے کی کوشش کی جارہی ہیں، اس لیے ضروری محسوس ہوا کہ اس بات کو دہرایا جائے کہ ہمارے ملک کا آئین اور سیکولر نظام تمام طبقات کو آزادی فراہم کرتا ہے، ساتھ ہی اس بات کا ملک کے ہر ایک شہری کو خیال رہے کہ آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی بھی طبقہ کسی بھی طبقہ کی دل آزاری یا اس کے جذبات کو مشتعل کرے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ ملک کی آئینی اور جمہوری روح کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ کوئی بھی قوم یا ملک ترقی کے تمام اہداف کو اسی وقت حاصل کرسکتا ہے جب کہ اس ملک کے تمام شہریوں کے ساتھ حق وانصاف اور برابری کا معاملہ کیا جائے۔

ہندوستان اور اسلام کا رشتہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ جنت سے آدمؑ کا زمین پر ورود، اس لئے کہ آدمؑ جو پہلے انسان بھی تھے اور پیغمبر بھی، مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ہندوستان میں ہی اتارے گئے تھے۔ اس لئے ہندوستان مسلمانوں کا محض مادرِ وطن ہی نہیں بلکہ پدری وطن بھی ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں سے نبی آخرالزماں ﷺ کو ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں۔ جہاں مسلمان آئے تو ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو رہے۔ وہ ہندوستان کی مٹی اور فضا میں اس طرح گھل مل گئے جیسے آنکھ میں کاجل اور فضا میں خوشبو سما جاتی ہے۔ وہ آٹھ سو سال تک یہاں حکمراں رہے لیکن ہمیشہ اقلیت میں رہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے مقامی لوگوں کو تبدیلی

مذہب کے لئے مجبور نہیں کیا اور قرآن کریم کی اس ربانی ہدایت پر عمل کیا کہ ''لا اکراہ فی الدین۔(دین میں کوئی زور زبردستی نہیں)''

ہندوستان اور ہندوستان کے رہنے والوں کے پہلے مدح خواں امیر خسرو ہیں اور اس روایت کو مختلف لوگوں نے آگے بڑھایا ہے جن میں غالبؔ، حالیؔ اور اقبالؔ سب شامل ہیں۔ غالبؔ کثرت میں وحدت کے قابل رشک مظاہر میں ثبات کا ان لفظوں میں تمنائی ہے کہ:

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

تو اقبالؔ اپنی نظم ''نیا شوالہ'' میں ہندوستان سے اپنے لگاؤ اور تعلق کو برہمن کے سامنے ان لفظوں میں ظاہر کرتے ہیں کہ:

پتھر کی مورتی میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

مولانا الطاف حسین حالیؔ ہندوستان کی عظمت اور اہمیت سے اپنے رشتے کو یوں بیان کرتے ہیں کہ:

تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی نے اپنی کتاب ''ہندوستان کی شرعی حیثیت'' جو خسرو فاؤنڈیشن کی تحریک پر لکھی گئی ہے، میں جن مباحث و مسائل پر گفتگو کی ہے یقیناً وہ آج کی ضرورت ہیں۔ انہوں نے کتاب کے پہلے باب میں بتایا ہے کہ ہندوستان کی

فضیلت واہمیت اور اس کے مناقب بے شمار ہیں جو اپنی رنگارنگی اور تعدد تکثیریت کے لیے جانے جاتے ہیں۔اسی کے ساتھ ان اعتراضات کا بھی تشفی بخش جواب دیا ہے جو تعصب یا نادانی کی وجہ سے آئے دن مسلم حکمرانوں کے رویہ پر کیے جاتے ہیں کہ ہندوستان میں جب مسلم حکومتیں قائم تھیں تو انہوں نے ملک کے ہندوؤں کے ساتھ سوتیلا یا امتیازی سلوک کیا جب کہ اس طرح کی چیزوں کا تاریخ یا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ دوسرے باب میں مصنف نے بتایا ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد و یگانگت اور یکجہتی کی روشن مثالیں تاریخ میں بے شمار ملتی ہیں۔ یہ روایات و واقعات اس بات کا درس دیتے ہیں کہ یہاں حکومت کسی کی بھی رہی ہو، اقتدار پر کوئی قابض رہا ہو مگر ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور ہندو مسلم اتحاد و اتفاق پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ اسی طرح کتاب کا تیسرا باب بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے جس میں یہ بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ ہندوستان کے سیکولر نظام اور یہاں کی جمہوری قدروں کو مسلمان نہ صرف تسلیم کرتے ہیں بلکہ ان کے ایمان و یقین کا حصہ ہے۔ نیز آئے دن مسلمانوں کی حب الوطنی پر شک کیا جاتا ہے، اس حوالے سے بھی اس باب میں نہایت مفید مباحث موجود ہیں۔آخری باب ''ہندوستان کی شرعی حیثیت جدید وقدیم آراء کی روشنی میں'' پر مشتمل ہے۔اس کے اندر جن چیزوں اور حقائق کو پیش کیا گیا ہے وہ بھی بڑے اہمیت کے حامل ہیں۔ ہندوستان کی شرعی حیثیت کی بابت مسلمانوں کا موقف ایک تو اس وقت کا ہے جب ہندوستان آزاد نہیں ہوا تھا اور ملک کی زمام اقتدار فرنگیوں کے ہاتھوں میں تھی۔اس وقت کے علماء نے اپنے فتوں میں بتایا تھا کہ ہندوستان دارالاسلام ہے، یہ آزادی سے پہلے کی بات ہے۔اس کے بعد ملک آزاد ہو گیا اور کسی

بھی دھرم اور دین کی حکومت قائم نہیں ہوئی بلکہ باتفاق رائے ہندوستان کو ایک سیکولر اسٹیٹ قرار دیا گیا۔ چنانچہ اب ہندوستان کے متعلق جو شرعی موقف ہے وہ یہ کہ ہندوستان نہ دارالاسلام ہے اور نہ دارالحرب بلکہ یہ دارالامن ودارالمعاہدہ اور دارالجمہور یہ ہے۔ عام طور پر یہ بات رائج ہے کہ مسلمان ہندوستان کو دارالحرب مانتے ہیں، یہ بالکل بے بنیاد اور غلط بات ہے۔ ہندوستان کو دارالحرب مسلمانوں نے کبھی نہیں کہا حتیٰ کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے فتویٰ پر بھی اہل علم نے لکھا ہے کہ وہ ان کا فتویٰ ہے یہ بات قابل یقین نہیں ہے۔ کتاب کے تمام مباحث پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں نہ حاکم ہیں اور نہ محکوم بلکہ اقتدار میں برابر کے شریک ہیں۔ امن وامان اور سکون واطمینان سے رہ رہے اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ کتاب ہمارے مابین بہت ساری غلط فہمیوں کو رفع کرنے اور ملک میں ہندو مسلم خلیج کو دور کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ بغیر جانے محض سنی سنائی باتوں پر یقین کرلیا جاتا ہے اور سامنے والے کے خلاف منفی رجحان بن جاتا ہے۔ بدقسمتی سے آج ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے حوالے سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے دوریاں اور نفرتیں بڑھتی دکھ رہی ہیں۔ اب وقت ہے کہ ہم حقائق اور تاریخ کو بلا کسی تعصب کے خود سمجھیں، جانیں اور پڑھیں، تاکہ تعصب اور نفرت کی یہ دبیز چادر اتر جائے اور بھائی چارگی، اخوت ومحبت کا چلن عام ہو جائے۔

ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی، جو دارالعلوم دیوبند کے سند یافتہ بھی ہیں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تربیت یافتہ بھی، مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ہماری دعوت پر انہوں

نے ایک اہم علمی کام کیا۔ امید کرتا ہوں ان کا یہ کام علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اس موضوع پر کام کرنے کی ضرورت اس لیے بھی تھی کہ مسلمانوں کے حوالے سے جو شکوک وشبہات برادران وطن کو ہیں وہ دور ہو سکیں اور ملک سے نفرتوں کا خاتمہ ہو جائے، محبتوں کا بول بالا ہو کیوں کہ ملک کی خوبی اور اس کا امتیاز ہمیشہ سے یہی رہا کہ ملک میں حالات کیسے بھی رہے ہوں مگر کبھی یہاں کے ہندو مسلم اتحاد پر کوئی حرف نہیں آیا ہے اور نہ آئے گا۔

آخر میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی کی کاوش کو قبول فرمائے اور انہیں دنیا و آخرت کی کامیابی سے نوازے۔ آمین

پروفیسر اختر الواسع

چیئر مین

خسرو فاؤنڈیشن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم۔

ہندوستان تہذیب وثقافت اور ادیان و مذاہب کا شاندار مرکز ومحور ہے، بلکہ وطن عزیز کی خوبصورتی کو یہاں کی رنگارنگی اور تعدد وتکثیریت نے مزید دوبالا کردیا ہے۔ اگر ہم ہندوستان کی قدیم تہذیب وتمدن کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ دونوں اقوام میں سماجی ومعاشرتی طور پر بہت سے معاملات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ متنوع افکار اور قدروں کے فروغ و بقاء اور ادیان و مذاہب کے مختلف ومتنوع ہونے کے باوجود باہمی اتحاد و یگانگت اور وحدت انسانی کا روشن و تابناک پہلو اجاگر ہوتا ہے، ہندوستان کی یہ روایات نہ صرف ایک دوسرے پر انحصار کا درس دیتی ہیں بلکہ امن وامان اور سکون و شانتی کی راہ میں حارج تمام رکاوٹوں کو بھی معدوم کرتی نظر آتی ہیں۔ جب ہمارا رویہ باہم مشفقانہ اور ہمدردانہ ہوگا، اخوت و بھائی چارگی باہمی اعتماد وارتباط اور میل جول کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے گا تو لازمی طور ہندوستانی سماج، تہذیبی، تمدنی، معاشی، اور اقتصادی طور پر صحت مند نظر آئے گا۔ یہ بھی یاد رہے کوئی سماج ومعاشرہ اسی وقت عروج وارتقاء کی تمام منازل سے ہمکنار ہو پاتا ہے جب اس کے اندر یکسانیت رواداری، انسان دوستی اور پرامن بقائے باہم کے اصولوں پر عمل کیا جاتا ہو۔ بھید بھاؤ اور تفریق و امتیاز کی پالیسیاں نہ صرف اس قوم کو زوال وپستی میں دھکیل دیتی ہیں بلکہ سچائی یہ ہے کہ ایسے معاشرے فکر وشعور اور عدل وانصاف کی دولت سے بھی محروم ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا لازمی طور پر اپنی دیرینہ روایات کی بقاء اور وطن عزیز کی تہذیبی قدروں کو

تحفظ فراہم کرنے کے لئے یکجائیت ومرکزیت کے ساتھ جد و جہد کرنی ہوگی۔آج بڑی شدومد کے ساتھ ہندوستان کا آفاقی امتیاز یعنی کثرت میں وحدت کو نابود ومعدوم کرنے کی ناکام کاوشیں ہورہی ہیں۔اس سے ہندوستانی معاشرے کی خوشحالی، باہم خوشگوار تعلقات اور پرکیف و پرافتخار فضا متاثر ہونے کا اندیشہ بڑھ رہا ہے۔اس کیفیت اور عدم اعتبار اور باہمی بڑھتی خلیج کے پس پردہ وہ باتیں اور غلط فہمیاں بھی ہیں جن کو منصوبہ بند طریقے سے ہندوستانی عوام کے اندر ترویج دیا گیا۔حتی کہ آج منظّم طریقے سے مسلمانوں کے خلاف غیر مناسب باتیں منسوب کی جارہی ہیں۔ان پر نوع بنوع کے الزامات عائد کئے جارہے ہیں۔اس کے نتیجے میں یہاں کی عوام کے اندر مسلمانوں کے خلاف منفی فکر پروان چڑھ رہی ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ مسلمان وہ قوم ہے جس نے ہر دور میں اپنے وطن سے محبت اور وفاداری کا ثبوت عملی طور پر دیا ہے اور آج بھی اس کی انگنت مثالیں کثرت سے ملتی رہتی ہیں۔اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان غلط فہمیوں کو دور کریں جو مسلمانوں کی نسبت پھیلائی جارہی ہیں۔اسی طرح ان چیزوں کا بھی سدباب ضروری ہے جو ہندوؤں کے متعلق غلط باتیں منسوب کی گئی ہیں۔انہیں قوموں اور معاشروں کے کارناموں کو تاریخ میں رقم کیا جاتا ہے جن میں سماجی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کی روایات واطوار کو پورے طور پر پروان چڑھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔بجا طور پر اب ضرورت ہے کہ عوام کے سامنے ان حقائق کو بروئے کار لایا جائے جن میں مسلم علماء وفقہاء اور دانشوروں نے اپنے ملک کے متعلق نہایت توسع اور فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ہے۔مسلم مفکرین نے ہندوستان کے متعلق اپنے مخلصانہ جذبات کو صرف زبانی طور پر ہی پیش نہیں کیا ہے بلکہ ان کی تحریروں میں بھی والہانہ محبت وعقیدت اور وفاداری کے عملی نمونے ملتے ہیں۔

اس بابت ''ہندوستان کی شرعی حیثیت'' پر عالمانہ اور محققانہ کام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یوں تو اس موضوع پر ماضی میں کافی کچھ لکھا گیا ہے جن میں فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خان صاحب کی ''اعلام الاعلام بان ہندوستان دار الاسلام'' اسی طرح مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی ''نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت'' موجود ہیں۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، سر سید احمد خاں جیسے اکابرین و اساطین علم کے علاوہ اکثر علماء نے بھی کافی کچھ لکھا ہے۔ البتہ اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

پہلا باب ہندوستان کی فضیلت، اور ہندو مذہب، ہندو دیوتاؤں اور ان کے لٹریچر کے فروغ پر مشتمل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے دین کی بابت نہایت توسع اور توازن کا رویہ اپنایا ہے۔ اسی طرح دوسرے باب میں ان روایات واقدار کو پیش کیا گیا ہے جو دونوں قوموں کے اتحاد و یگانگت اور وحدت پر مبنی ہیں۔ تیسرے باب میں حب الوطنی، سیکولرزم کے حوالے سے گفتگو کی ہے جو اس بات پر شاہد ہے کہ ہندوستان کے مسلمان سیکولر نظریہ کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے وطن سے محبت والفت بھی بے پناہ کرتے ہیں۔ چوتھے باب میں ہندوستان کی شرعی حیثیت آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کیا تھی اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ یقیناً راقم کی یہ ادنی کاوش ہندوستانی معاشرے کے اندر باہمی اعتماد و اتفاق اور رواداری کے فروغ میں سنگ میل ثابت ہوگی۔ خود ہمیں اور ہماری نسلوں کو ایک اچھا اور پر سکون ماحول مل سکے گا۔

آخر میں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں بہت ساری خامیاں رہ گئی ہوں گی، لہٰذا قارئین سے درخواست ہے راقم کو معاف فرمائیں۔ نیز ان کا بھی متشکر ہوں جنہوں نے اس مقالے کی ترتیب وتبویب میں میری کسی

بھی طرح مدد کی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سرمایہ کو علمی حلقوں میں قبولیت عطا فرمائے اور راقم کے لئے توشۂ آخرت بنائے۔[آمین]

ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی

باب اول:

ہندوستان کا مذہبی، سماجی اور سیاسی نظام

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے یہاں بہت سے ادیان وافکار پائے جاتے ہیں۔وطن عزیز کی قابل قدر رنگارنگی اورتعدد پسندی نے باہم قوموں اور تہذیبوں کو بہت قریب کردیا ہے۔یوں تو دنیا میں جتنی بھی تہذیبیں اورثقافتیں پائی جاتی ہیں ان کے مدمقابل ہندوستان اپنی منفرد خصوصیات اوریکجہتی وہم آہنگی کے لیے امتیازی اہمیت کا حامل ہے۔لہٰذا ملک کی ان صالح اورہم آہنگ اقدار کوبروئے کارلانے کی ضرورت ہے۔اس وقت ہمارے اردگرد جو ماحول پروان چڑھ رہاہے اس نے بہت حدتک باہمی اتحاد اورمشترکہ اقدار کومخدوش کر ڈالا ہے۔اس کی بہت ساری وجوہات ہوسکتی ہیں لیکن ان میں نمایاں بات یہ ہے کہ آج ہندوستانی مسلمانوں کے حوالے سے برادران وطن کے اندر بہت ساری تاریخ وتہذیب کے نام پر غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں۔لہٰذا اس مقالہ میں نہ صرف ہمارے درمیان رائج بے بنیاد باتوں کا ازالہ کیا جائے گا بلکہ یہ بھی بتانے کی سعی کی جائے گی کہ ہندوستان کی اہمیت وفضیلت نیز ہندوستانی تہذیب وثقافت کے متعلق مسلم علماءاورمفکرین وباحثین کے خیالات کس قدراہمیت کے حامل ہیں۔

ہندوستان کی فضیلت:

یہ سچ ہے کہ ہندوستان اور یہاں کا معاشرہ ابتداء ہی سے امتیازی اوصاف کا حامل رہاہے۔یہی وجہ ہے کہ ملک کی فضیلت کے متعلق مسلم علماء نے نہایت مثبت کلمات ادا کیے ہیں۔چنانچہ آزادبلگرامی اپنی کتاب ’’سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان‘‘ میں حضرت آدمؑ کے دورکا ذکرکرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ’’جب آدمؑ سب سے پہلے ہندوستان میں اترے اور یہاں
> پر وحی آئی تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہی وہ ملک ہے جہاں خدا کی

پہلی وحی نازل ہوئی اور چونکہ نور محمدی حضرت آدمؑ کی پیشانی
میں امانت تھا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محمدﷺ کا ابتدائی
ظہور اس سرزمین میں ہوا ہے۔ اس لیے آپ نے فرمایا کہ
مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے۔"(۱)

علامہ سیوطی ابن جریر حاکم بیہقی اور ابن عساکر کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا:

"سب سے پاکیزہ اور خوشبودار مقام ہندوستان ہے کیونکہ
یہاں حضرت آدمؑ اترے اور یہاں کے درختوں میں جنت
کی خوشبو کا اثر ہے۔"(۲)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن علیگ نے "ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک" (جو ہندو اور مسلم مصنفین کے مقالات کا مجموعہ ہے) میں شیخ علی رومی کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ "ہندوستان وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے حکمت کے سرچشمے ابلے۔"(۳)

مسلمانوں کے نزدیک ہندوستان کی عظمت وفضیلت کیا ہے؟ اس بات کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے، چنانچہ سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق کے مطابق قرآن پاک میں "اس جنت نشاں ملک کی تین خوشبوؤں کا ذکر ملتا ہے۔ یعنی مسک، (مشک) زنجبیل (سونٹھ یا ادرک) اور کافور (کپور)۔"(۴)

---

(۱) بلگرامی، غلام علی آزاد حسین، واسطی، سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان (تقدیم وتحقیق محمد سعید الطریحی) بیروت لبنان، ۲۰۱۵ء، ص:۴۲

(۲) ایضاً، ص:۴۴

(۳) سید صباح الدین عبدالرحمٰن (علیگ) ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک، ص:۲

(۴) ندوی، سید سلیمان (مولانا)، عرب وہند کے تعلقات، معارف پریس اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء، ص:۵۴

اس طرح سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی مذکورہ کتاب میں پروفیسر محمد زبیر صدیقی (کلکتہ یونیورسٹی) کے رسالہ انڈو نیشین کلچر کے حوالہ سے رقم کیا ہے:

''شروع میں ہی لوگوں کو ہندوستان سے بڑا لگاؤ تھا اور وہ اسلام سے بہت پہلے اپنی لڑکیوں اور معشوقہ کا نام ہندہ رکھتے تھے اور بہت سی ہندوستانی چیزوں کے نام مثلاً ہندی تلوار صندل اور عود کا ذکر ایام جاہلیت کے شعراء کے کلام میں پایا جاتا ہے۔''(۱)

بالائی سطروں میں مذکور واقعات وروایات پر جرح وقدح بھی کی گئی ہے۔ البتہ صرف نظر اس سے یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ ہندوستان کی فضیلت و تقدس اور اس کی عظمت وجلال کو مسلم مفکرین نے بلاتعصب وجانبداری کے پیش کیا ہے۔ یقیناً ان روایات سے ہندوستانی معاشرہ میں عمومی طور پر ہم آہنگی پیدا ہوگی اور باہم نفرت وتعصب کا خاتمہ ہوگا۔ ہندوستان جیسے مخلوط اور تکثیری سماج کو نئی روح ملے گی۔ اس ضمن میں بزرگ بن شہریار کی کتاب ''عجائب الھند'' کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

''سرندیپ اور اس کے آس پاس والوں کو پیغمبر اسلام کی بعثت کا حال جب معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے میں سے ایک سمجھدار آدمی کو تحقیق حال کے لیے عرب روانہ کیا وہ رکتے رکاتے جب مدینہ پہنچا تو رسول ﷺ کے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت بھی ختم ہوچکی اور حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا۔ وہ ان سے ملا اور محمد ﷺ کے احوال معلوم کیے،

(۱) ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک، ص:۲

حضرت عمرؓ نے حضورﷺ کے احوال بڑی تفصیل سے بتائے۔ جب وہ واپس ہوا مکران (بلوچستان کے پاس) پہونچ کر مر گیا اس کے ساتھ اس کا ایک ہندو نوکر تھا۔ وہ صحیح سلامت سرندیپ پہنچ گیا اور ان کے فقیرانہ اور درویشانہ طور طریق کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ کیسے متواضع اور خاکسار ہیں اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں اور مسجد میں سوتے ہیں، اب یہ لوگ (سرندیپ کے ہندو) مسلمانوں کے ساتھ اس قدر محبت اور میلان رکھتے ہیں کہ وہ اس سبب سے ہوا۔''(۱)

اس واقعہ سے جو باتیں اخذ ہوتی ہیں ان میں ایک تو یہ کہ قدیم ہندوستان میں ہندو مسلم تعلقات کو بہتر بنانے کی سعی ہوئی۔ دراصل یہی ہمارے ملک کی خصوصیت ہے کہ اخوت ورواداری اور باہم اثر پذیری نے ہندوستان کی تہذیبی اور آئینی قدروں کو جلا بخشی ہے۔ ہندوستان کے اندر جو مشترکہ قدریں پائی جاتی ہیں اور اس کی فضیلت کے متعلق جو آثار وشواہد مسلم اسکالر اور مذہبی مصنفین کی تحریروں میں پائے جاتے ہیں وہ ہندوستانی معاشرے کی قدروں کو مستحکم کرتی ہیں۔ رواداری اور باہم میل ملاپ کے رہنما اصول وخطوط متعین ہوتے ہیں:

''ہندوستان سے مسلمانوں کی عقیدت ومحبت اور فضائل پر مبنی تحریروں کے بہت سے خزانے موجود ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے ''مقالات شبلی'' میں امیر خسروؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ

(۱) ایضاً ص:۳۔۴

انہوں نے اپنی شاعری میں ہندوستان کے فضل و رتبہ کو بڑی عقیدت اور رواداری کے ساتھ بیان کیا ہے۔شبلی نعمانی کی تحقیق کے مطابق امیر خسروؒ نے ایک مثنوی ''نہ سپھر'' نام سے لکھی ہے۔اس میں انہوں نے ہندوستان کی فضیلت سے متعلق ایک باب قائم کیا ہے۔اس طرح ڈاکٹر وحید مرزا نے مثنوی ''نہ سپھر'' کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔اس پر انگریزی میں ایک پر مغز اور مفید مقدمہ لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ یہ مثنوی بہت دلچسپ ہے۔اس میں ہندوستان کی آب وہوا، پھول، پرندوں، جانوروں اور یہاں کے علوم، مذہبی عقائد اور زبانوں سے متعلق بہت سی مفید معلومات ہیں۔امیر خسروؒ نے خراسان اور دوسرے ممالک پر ہندوستان کی فضیلت ثابت کی ہے۔وہ کشور ہند کو زمین کی بہشت اس لیے سمجھتے ہیں کہ خلد سے حضرت آدمؑ نکلے تو ہندوستان ہی میں آئے۔ جہاں کی زمین زرخیز اور بارآور ہے اور جہاں کی آب وہوا میں اعتدال ہے اور جہاں طاؤس بھی اور مار بھی ہیں۔''(۱)

امیر خسروؒ نے جو مثنویاں تحریر کی ہیں اور جن میں ہندوستان کی شان وشوکت کا جا بجا ذکر موجود ہے وہ درج ذیل میں عشقیہ مثنویاں: مطلع الانوار، بشرین وخسرو، مجنوں و لیلےٰ، آئینۂ سکندری، ہشت بہشت، اس کے علاوہ تاریخی مثنویاں درج ذیل ہے: قران السعدین، مفتاح الفتوح، عاشقہ، نہ سپھر، تغلق نامہ

(۱) ایضاً، ص: ۱۹۵۔۱۹۷

وغیرہ وغیرہ۔ مذکورہ تمام شواہد کی روشنی میں یہ کہنا مناسب ہے کہ ہندوستان قدیم زمانہ سے آج تک اپنے دامن میں بہت سارے انقلابات اور فضائل رکھتا ہے۔ ان تمام چیزوں کے باوجود اہم بات یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے متفقہ طور پر ہندوستان کی علوشان کا نہ صرف تذکرہ کیا ہے بلکہ وطن سے عقیدت ومحبت اوران کی وطن دوستی بھی نمایاں طور پر معلوم ہوتی ہے۔ بناء بریں اس فکر وفلسفہ کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ ہندوستانی معاشرہ تمام طرح کی بدنظمیوں اور بدعنوانیوں سے مبرہ ہوسکے۔

ہندومت اور مسلمان:

یہ بات عیاں ہے کہ ہندوستان مختلف الخیال اور متعدد ادیان ومذاہب کا بہترین مرکز ومحور ہے،لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ ہندوستان کا قدیم ترین مذہب ہندودھرم ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندودھرم کے متعلق مسلمانوں کی کیا آراء پائی جاتی ہیں۔ یہاں پہلے دین ودھرم کے متعلق ایک اصول سمجھنا ضروری ہے جوڈاکٹر محمد عمر صاحب نے ''آئین اکبری'' کے حوالے سے اپنی کتاب ''ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پراثر'' میں رقم کیا ہے:

> ''کسی دین ودھرم میں کوئی خصوصیت نہیں۔ایک ہی دلآویز حسن ہے جومختلف طریقوں پرجلوہ آرائیاں کررہا ہے۔ ہرگز وہ اپنے اپنے عقائد کی گرم بازاری کرنااورخواب وخیال میں مسرور وشاداں نظرآتا ہے،لیکن جب انسان اپنی ان عادات کوترک کردیتاہےاوراس پر یک رنگی کی مہرانگیز شعائیں پڑتی ہیں تواس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اورتقلید کا شیرازہ بکھر کرتارتار ہوجاتا ہے۔اگرکوئی دردآشنا قلب مجبوراً ان اسرار

کوظاہر کرتا ہے تو کم فہم سعادت پذیر افراد اس کو دیوانہ سمجھ کر اس کے قول کا اعتبار نہیں کرتے اور بدسرشت نالائق اس کو کافر وملحد کہہ کر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں لیکن جب بنی نوع انسان کی بلندیٔ طالع کا وقت آتا ہے اور مشیت الٰہی یہ ہوتی ہے کہ زمانہ حق پرستی کے مبارک آثار و برکات سے مستفید ہو تو فرمانروائے وقت کو اسرار یک رنگی سے آشنا کیا جاتا ہے اور بادشاہ کی ذات ظاہری حکمراں کے علاوہ باطنی رہنمائی بھی کرتی ہے۔ حضرت کے قلب مبارک میں ہدایت و رہنمائی کی لہریں اٹھیں اور بادشاہ حقیقتاً شناس نے اب مجبور ہو کر منصب پیشوائی اختیار کرنا مرضیٔ الٰہی سمجھا اور ہدایت کا دروازہ ہر خاص و عام کی پرواہ کر کے حقیقت طلب تشنہ لبوں کو سیراب فرمانے لگے‘‘۔ (۱)

اس حقیقت کو پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب ’’سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات‘‘ میں ٹالسٹائی کی معروف کتاب "What is Religion? and other writigns" کے حوالہ سے اس طرح لکھا ہے:

’’قرونِ وسطیٰ میں جن چیزوں نے انسانی فکر کو متاثر کیا وہ دو تھیں: قوت اور مذہب۔ البتہ کارلائل کا نظریہ یہ ہے کہ لامحدود قوت کے ذریعہ انسان کے جسم پر تسلط حاصل کیا جا سکتا تھا لیکن اقلیم دل کی فتح ممکن نہیں۔ مذہب کی حکمرانی انسان کے ان بنیادی جذبات پر تھی جہاں اس کی فکر و نظر کے

(۱) محمد عمر، ڈاکٹر، ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ۱۹۷۵ء، پبلی کیشن ڈویژن اے ایم یو علی گڑھ، ص: ۲۴

سانچے ڈھلتے تھے اور جہاں اس کی شخصیت کی تعمیر ہوتی تھی،
غالباً اسی اہمیت کے پیش نظر کارلائل نے کہا تھا کہ اگر کسی شخص
یا قوم کی تاریخ کی روح تک پہنچنا ہوتو اس کے معتقداتِ
مذہبی کی تحقیق کرنی چاہئے''۔ (۱)

اس طرح مذہب کی ماہیت اور اس سے انسانی رشتہ کی نوعیت کا جائزہ کئی مغربی فاضلوں نے اپنے اپنے انداز سے لیا ہے۔ چنانچہ نیدرلینڈ کے معروف فاضل G.Van Der Leeuw نے پتہ لگایا ہے:

''مذہبی جذبات انسان کے کردار اور اس کے بنائے ہوئے
اداروں میں کس طرح ظاہر ہوتے ہیں''۔ (۲)

مذکورہ افکار کے تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی میں مذہب کا بڑا عمل دخل ہے، یہی وجہ ہے کہ کائنات میں بسنے والی انسانی سوسائٹی کسی نہ کسی اعتبار سے کسی بھی فکر، نظریہ اور عقیدہ سے لازمی طور پر وابستہ ہے، اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ کسی بھی مذہب و دین اور نظریہ کی بے حرمتی یا اس کی توہین وتذلیل ہرگز نہیں کرنی چاہئے، اسی اصول کو قرآن کریم میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ قرآن میں مذکور ہے:

وَلاَ تَسُبُّواْ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّهِ فَيَسُبُّواْ اللّهَ عَدْواً
بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَى رَبِّهِم
مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ۔ (۳)

''یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں تم انہیں برا بھلا نہ کہو کہ

(۱) نظامی، خلیق احمد، پروفیسر، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، الجمعیۃ پریس دہلی، ۱۹۵۸ء، ص:۳
(۲) ایضاً، ص:۳-۴
(۳) الانعام:۱۰۸

وہ حد سے آگے بڑھ کر جہالت کی بناء پر اللہ کو برا بھلا کہنے
لگیں گے،اس طرح ہم نے ہر گروہ کا خوشنما عمل بنادیا ہے،
پھرانہیں اپنے رب کے پاس لوٹنا ہے،اورانہیں بتائے گا وہ کیا
کررہے تھے۔''

اس مذکورہ آیت سے پتہ چلا کہ کائنات میں رائج تمام ادیان مراد ہیں، لہٰذا کسی بھی فکر وفلسفہ اور دین ودھرم کو دشنام طرازی کرنے کی سخت ممانعت ہے، بلکہ سچائی یہ ہے کہ باہمی امن وامان اور قومی خیرسگالی کوفروغ دینے کے لیےادیان کا باہم احترام بہت ضروری ہے۔رہا یہ سوال کہ ہندودھرم کے متعلق مسلم اسکالرس کی کیارائے ہےتواس سلسلہ میں مذکور ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم باہم ساتھ رہنے کااثر یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ہندودھرم کے حسن وقبح کابڑی گہرائی سے مطالعہ کیااور باضابطہ اس پر کتابیں بھی تحریر کیں۔چنانچہ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی کتاب ''ہندوستانی تہذیب کامسلمانوں پراثر'' میں لکھاہے کہ داراشکوہ نے مجمع البحرین میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے:

''ہندومذہب اوراسلام دومتضاد مذاہب نہیں ہیں بلکہ ان کا
سرچشمہ ایک ہی ہے۔دومختلف دھارائیں الگ الگ رواں
دواں نظرآتی ہیں لیکن بالآخر وہ دونوں ایک نقطے پر ایک
دوسرے میں جذب ہوجاتی ہیں۔''(۱)

داراشکوہ کےحوالے سے ڈاکٹر محمد عمر نے یہ بھی لکھاہے:

''حقیقتوں کی حقیقت کوجاننے کے بعداورصوفیوں کے مذہب
کےرموز اورنزاکتوں کے متعین ہونے کے بعداوراس عطیہ

---

(۱) ہندوستانی تہذیب کامسلمانوں پراثر،ص:۳۴

عظمیٰ کو حاصل کرنے کے بعد مجھے ہندوستان کے موٗحدین
کے مذہبی عقائد کا ادراک حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی،
ہندوستان کے عالموں کے ساتھ ساتھ برابر بحث ومباحثہ اور
ان کی ہم جلیسی کے بعد جنہوں نے مذہبی معاملات میں
کاملیت کا مرتبہ حاصل کرلیا تھا مذہب کی روح تک رسائی
اور خدا کی ذات کا ادراک حاصل کرلیا تھا، مجھے (داراشکوہ)
لفظی تفاوت کے علاوہ ان کے حقائق شناس کے راستے اور
طرز میں کوئی ممیّز فرق نظر نہیں آیا۔اس لیے دونوں فریقوں
کے خیالات کو یکجا کرکے اور دونوں کے نکات جمع کرکے جن
کا علم حق کے ایک متلاشی کے لیے نہایت ضروری اور فائدہ
مند ہے۔ میں نے ایک رسالہ تصنیف کیا اور اس کا نام ''مجمع
البحرین'' رکھا کیونکہ یہ دونوں فرقوں کے حق شناسوں کی
دانشمندی اور سچائی کا مجموعہ ہے۔''(۱)

ایک مرتبہ مرزا مظہر جان جاناں سے سوال کیا گیا کہ کیا ہندوستان کے کافر عرب کے مشرکین کے مانند اپنا بے اصل دین رکھتے ہیں یا اس دین کی کوئی اصل تھی اور اب منسوخ ہوگئی ہے، دیگر ان لوگوں کے بزرگوں کے حق میں کیسا برتاؤ رکھنا چاہئے؟ مرزا مظہر نے جواب دیا:

''واضح رہے کہ اہل ہند کی قدیم کتابوں سے جو کچھ معلوم
ہوتا ہے وہ یہ کہ نوع انسانی کی پیدائش کے شروع میں رحمت
الٰہیہ نے لوگوں کو معاد ومعاش کی اصلاح کے لیے ایک

(۱) ایضاً،ص:۳۴۔۳۵

کتاب مسمی بہ وید،جس میں چار دفتر ہیں اور امر ونہی کے احکام اور ماضی و مستقبل کے واقعات ہیں ایک فرشتہ برہما کے وسیلے سے جو ایجاد عالم کا واسطہ ہے نازل کی۔اس زمانہ کے مجتہدوں نے اس کتاب سے چھ مذاہب استخراج کئے اوراصول وعقائد کی بناء ان پر قائم کی،اس کوفن دھرم شاستر کہتے ہیں۔یعنی فن ایمانیت جس سے علم کلام مراد ہے اسی طرح (مجتہدین) نے نوع انسانی کے چار فرقے بنائے اور ہرفرقے کے لیے الگ مسلک مقرر کیا اور فروع اعمال کی بناء اس پر قائم کی اس فن کا نام کرم شاستر رکھا یعنی فن عملیات جسے علم فقہ کہتے ہیں۔یہ لوگ نسخ احکام کے منکر ہیں لیکن چونکہ وقت اور طبیعتوں کے مطابق تغیر اعمال بھی ضروری ہے۔اس لیے دنیا کی ساری مدت کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر ایک حصہ کا نام جگ رکھا ہے ہر ایک جگ کی علامتیں انہیں چار دفتروں سے اخذ کی ہیں،جو کچھ متاخرین نے ان میں تصرفات کیے ہیں وہ قابل اعتبار نہیں۔ان کے تمام فرقے توحید الٰہی کے بارے میں متفق ہیں۔عالم کومخلوق مانتے ہیں۔فنائے عالم،نیک وبد کی جزاوسزا حشر ونشر،جسمانی اور حساب وکتاب کے قائل ہیں۔علوم عقلی ونقلی ،ریاضت ومجاہدات،تحقیق ومعارف اور مکاشفات میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ان کی بت پرستی شرک کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے دوسرے اسباب ہیں:

ان کے علماء نے انسانی عمر کے چار حصے کیے ہیں۔ پہلا تحصیل علم کے لیے، دوسرا معاش اور اولاد کی غرض سے، تیسرا درستیٔ اعمال اور تہذیب نفس کے لیے، چوتھا تجرد وتنہائی کی مشق کے لیے جو کمال انسانی کا انتہائی درجہ ہے اور نجات کبریٰ جسے مہا مکت کہتے ہیں، اس پر موقوف ہے۔اس دین کے قواعد وضوابط میں مکمل نظم ونسق ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ مرتب دین تھا اور اب منسوخ ہو گیا اور شرع میں منسوخ شدہ مذاہب میں سوائے یہود ونصاریٰ کے دین کے اور کسی کا ذکر نہیں، حالانکہ ان کے علاوہ بھی بہت سے مذاہب منسوخ ہوئے اور بہت سے پیدا بھی ہوئے ہیں۔ جاننا چاہئے کہ سورۂ فاطر کی آیت کریمہ کے مطابق: و ان امة الا خلا فیھا نذیر اور سورہ یونس کی آیت کے مطابق ا ولکل امة رسول (کوئی امت ایسی نہیں ہے کہ جس میں رسول نہیں بھیجا گیا ہو) اور دیگر شواہد کے مطابق ممالک ہند میں بھی انبیاء اور رسول بھیجے گئے اور جن کے احوال ان کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں اور جو کچھ ان کے آثار باقی ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے وہ سب صاحب کمال تھے۔اور رحمت عامہ نے اس وسیع مملکت کے انسانی معاملات کو فراموش نہیں کیا تھا، محمد ﷺ کی بعثت سے قبل ہر قوم میں پیغمبر بھیجے گئے تھے اور پوری قوم پر اپنے پیغمبر کی اتباع لازمی تھی نہ کہ دوسری قوم کے پیغمبر کی لیکن محمد ﷺ کی بعثت کے بعد رہتی دنیا تک کوئی دوسرا نبی نہ

ہوگا۔ کسی کو ان کی نافرمانی کی مجال نہیں ہے۔ چنانچہ محمد ﷺ کی آمد سے آج تک ایک ہزار ایک سو اسّی سال گزرے جوکوئی ان کا معتقد نہ ہوا، کافر ہے۔ لیکن اگلے لوگ نہیں۔ نیز حسب تصریح سورۂ غافر کی آیت کریمہ **قصصنا علیک ومنھم من لم نقصص علیک** (ان میں سے بعض کا حال تمہارے روبرو بیان کیا اور بعض کا نہیں) جب ہماری شریعت بہت سے انبیاء کے احوال میں خاموش ہے۔ تو ہم کو بھی ہندوستان کے انبیاء کے حق میں خاموش ہی رہنا چاہئے۔ نہ تو ہمیں ان کی پیروی کرنے والوں کے کفر و ہلاک کا تعین لازم ہے اور نہ ان کی نجات پر تعین کرنا چاہئے۔ اس معاملہ میں حسن ظن ضروری ہے۔ بشرطیکہ تعصب درمیان میں نہ ہو۔ اور اہل فارس کے حق میں بلکہ ہر ملک والوں کے حق میں جو محمدؐ کی بعثت سے قبل گزرے ہیں اور شریعت کی زبان جن کے بارے میں خاموش ہے۔ یہی عقیدہ رکھنا اچھا ہے اور بغیر کسی قطعی دلیل کے کسی کو کافر کہنا آسان نہیں سمجھنا چاہئے اور ان لوگوں کی بت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ بعض فرشتے جو اللہ کے حکم سے اس عالم کون وفساد میں تصرف رکھتے ہیں یا بعض کاملوں کی روحیں جن کا جسموں سے ترک تعلق کے بعد بھی اس کائنات میں تصرف باقی ہے۔ یا بعض ایسے زندہ لوگ جو ان لوگوں کے خیال میں حضرت خضر کی طرح زندہ جاوید ہیں۔ ان کے بت

بنا کران کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اوراس توجہ کے سبب سے
کچھ مدت کے بعد صاحب صورت سے رابطہ کر لیتے ہیں اور
اس کی بنیاد پر دنیا اور عاقبت کے تعلق سے اپنی احتیاجوں کو
پورا کرتے ہیں۔اوران کا یہ عمل ذکرربط سے مناسبت رکھتا
ہے جومسلمان صوفیوں کا طریقہ ہے کہ اپنے پیر کی صورت کا
تصور کرتے ہیں اوراس سے فیض اٹھاتے ہیں۔بس اتنا فرق
ہے کہ (مسلمان) پیر کا بت نہیں تراشتے۔لیکن یہ بات
کفارعرب کے عقیدے سے مناسبت نہیں رکھتی۔کیونکہ وہ
تو بتوں کو اپنی ذات سے مؤثر اور متصرف کہتے تھے اللہ تعالیٰ
کے تصرف کا ازالہ نہیں سمجھتے تھے اوران کو زمین کا خدا جانتے
تھے اورخدا کو آسمان کا۔ یہ الوہیت میں شرک ہے۔ ان کا
(کفارہند) سجدہ کرنا سجدۂ تہنیت ہے۔سجدۂ عبودیت نہیں۔
جوان لوگوں کے مذہب میں ماں، باپ، پیراوراستاد وغیرہ
کوبھی سلام کی جگہ کرتے ہیں اوراسے ڈنڈوت کہتے
ہیں،تناسخ پراعتقادرکھنے سے کفرلازم نہیں آتا ہے۔"(۱)

علاوہ ازیں ڈاکٹرمحمد عمر نے لکھا ہے کہ"جہانگیر کی طرح شاہ جہاں ہندو جوگیوں اورسنیاسیوں کا قائل نہ تھا لیکن اس کے دورحکومت میں یہ رجحانات ختم نہیں ہوئے تھے اوراس کے دورِحکومت کے آخری دنوں میں داراشکوہ کی شرکت سے انہیں بڑی تقویت ملی تھی۔مسلمانوں میں داراشکوہ، ملاشاہ بدخشی، سرمدشہید اورمحسن فانی کے علاوہ دوسرے کئی آزادخیال روحانی مفاہمت اور داراشکوہ کے

(۱) خلیق انجم، مرزامظہرجان جاناں کے خطوط، الجمعیۃ پریس، ۱۹۶۲ء، ص: ۹۲-۹۵

ترجمان تھے۔ان کے علاوہ دوسرے کئی ایسے مسلمان تھے جو ہندو سادھوؤں اور جوگیوں کی روحانیت کے قائل تھے اور ان سے مل کر متاثر بھی ہوئے تھے''۔ (۱)

ان کے علاوہ بیرونی نے ہندوؤں کے عقائد کے متعلق اپنی معروف کتاب ''تحقیق ماللھند'' میں نہایت اہم نکتہ درج کیا ہے۔اس کو یہاں پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

> ''اللہ پاک کی شان میں ہندوؤں کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ واحد ہے، ازلی ہے، جس کی نہ ابتداء ہے، نہ انتہاء، اپنے فعل میں مختار ہے، قادر ہے، حکیم ہے، زندہ ہے، زندہ کرنے والا ہے، صاحب تدبیر ہے، باقی رکھنے والا ہے، اپنی بادشاہت میں یگانہ ہے جس کا کوئی مقابل اور مماثل نہیں ہے، نہ وہ کسی چیز سے مشابہ ہے اور نہ کوئی چیز اس کی مشابہت رکھتی ہے''۔ (۲)

معروف محقق ومصنف ابوالفضل فیضی کی متداول کتاب ''آئین اکبری'' کے حوالے سے محمد سعید نے اپنی کتاب ''امرائے ہنود'' میں ہندوؤں کے مذہب کے متعلق لکھا ہے:

> ''میں ہندو عقل مندوں کی صحبت میں بہت رہا ہوں اور میں نے ان کے ہر فرقے اور مذہب کے مسائل معلوم کرکے اس کتاب میں اس غرض سے لکھے ہیں کہ آئندہ کے عقلمند افلاطون، ارسطو اور صوفیوں کے مسائل سے ان کا مقابلہ کرکے بلادخل دیئے اور تعصب کے یہ معلوم کرسکیں گے کہ

---

(۱) ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص: ۳۵

(۲) بیرونی، ابوریحان، محمد بن احمد (۱۰۴۸م) کتاب البیرونی فی تحقیق ماللہند، مترجم: سید اصغر علی، الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۲۰۰۵ء، ص: ۲۷

حقیقت کیا چیز ہے، ہندوؤں کی کتابوں میں نہایت بے بہا اوراعلیٰ ہدایتیں ہیں، میں اپنے مضمون کو کیسے ادا کروں جب کہ میں کار دنیا میں غرق ہوں (ہندو) خدا کو خوش کرنے کی غرض سے اپنی زندگی کو بخوشی دے دیتے ہیں۔سب لوگ خدا کو ایک مانتے ہیں اور اگر لوگ پتھر اور لکڑی کی مورت یا کسی اور چیز کی تعظیم کرتے ہیں تو اس کو بیوقوف آدمی تو بت پرستی جانتا ہے،مگر میں نے بہت سے عقلمندوں سے معلوم کیا ہے کہ انہوں نے بعض خدا پرستان مقبول بارگاہ کی تصویر کو وسیلہ اپنی دل جمعی کا مقرر کیا ہے تا کہ ان کا دل دوسری طرف منتشر نہ ہو اور وہ خدا کی عبادت ضروری سمجھتے ہیں اور اپنی تمام عبادتوں اور عادتوں میں اس سے مدد مانگتے ہیں اور اس کو سب سے برتر سمجھتے ہیں اور برہما کو اپنا خالق اور بشنو کو پالنے والا اور مخلوق کو قائم رکھنے والا جانتے ہیں اور مہادیو کو نیست و نابود کرنے والا مانتے ہیں،ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ خدا نے ان پاک مورتوں میں اس طرح جنم لیا ہے کہ قطعی ناپاک نہ ہوا۔اور یہ مثال بعینہٖ ایسی ہی ہے کہ جس طرح نصاریٰ مسیح کو بزرگی دیتے ہیں اور ایک گروہ اس بات پر ہے کہ انسان اپنی نفاست اور خدا پرستی اور نیک عادتوں سے اعلیٰ رتبے پر پہنچتا ہے۔غرض کہ خدا پرستی اور نفس کشی ان لوگوں میں اس قدر ظاہر ہوتی ہے کہ اور کسی ولایت میں نہیں ہے‘‘۔(۱)

---

(۱) منشی محمد سعید احمد، مارہروی، امرائے ہنود، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن، ۱۹۳۲ء،ص:۲۸۔۳۰

داراشکوہ ہو یاالبیرونی اسی طرح مرزامظہرجان جاناں یادیگراصحاب فکروفن انہوں نے ہندوؤں کے مذہب،اوران کی تہذیب کاانتہائی کشادہ ظرفی اور وسعت وتوازن سے مطالعہ کیاہے،یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں جولکھا اورکہا وہ بہت اہم ہے دوسری بات یہ ہے کہ مذکورہ افکار سے کسی کواعتراض ہوسکتاہے البتہ یہاں ان خیالات کوپیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں نے کس قدرتوسع کا مظاہرہ کیا اور ہندوؤں کے مذہب، دین ودھرم کے بارے میں بہت ہی مناسب اورمتوازن کلمات ادا کئے ہیں، ان افکار کے فروغ دینے سے عوامی سطح پرفوائد حاصل ہوں گے نیز دونوں اقوام کے مابین صلح وآشتی اورامن وامان کا پیغام بھی جائے گا۔ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ہندوتہذیب یاہندودھرم جہاں اپنے اندر بہت ساری وسعتیں اور پیچیدگیاں رکھتاہے وہیں اس کی بابت مسلمانوں کا منصفانہ کرداراور رویہ نہایت موزوں ہے۔ یقیناً اس سے جہاں ملک کی تہذیبی قدریں مستحکم ہوں گی وہیں یہ بھی پتہ چلے گا کہ مسلمانوں نے اپنے مذہب کےعلاوہ دوسرے مذاہب وادیان پربھی بہت کچھ لکھاہے۔تاریخوں اور مذہبی نوشتوں میں موجودشواہداس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ ابتداء میں خصوصاً ہندوخواص کابھی عقیدہ مشرکانہ نہیں بلکہ توحید پرمنحصر ہے، یہی وہ مشترکہ عناصر ہیں جن کی بناء پر بہت سے مسلم علماءاورصوفیوں نے ہندومذہب کی تعریف وتوثیق کی ہے۔اس طرح دیگراصحاب علم وفہم مسلمانوں نے بھی بت پرستی کی مذمت وتوثیق نہیں کی ہے یہی وجہ ہے کہ اس دورکےادب میں بت پرستی کی مذمت نہیں پائی جاتی ہے کیونکہ وہ لوگ ظاہری اعمال وسنسکاروں کوزیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے، بلکہ ان افعال میں جن پوشیدہ جذبات کی ترجمانی ہوتی ہےان کا پورا احترام کرتے تھے، جوشش نے بت پرستی کے متعلق کہاہے۔

جسم وحدت سے گر کوئی دیکھے
بت پرستی بھی حق پرستی ہے

واقف لاہوری نے ہرقوم وملت کے نیک افراد کے ساتھ بلاکسی تعصب کے نشست و برخاست اوران کی صحبت سے روحانی فیض کسب کرنے کی تلقین کی ہے۔

نیک صحبت ہرقوم چشیدن دارد۔ذوق پیدا کن و با گیرو مسلمان بنشیں ۔ غالب نے بھی کیا خوب لکھا ہے ؎

وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے
مَرے بت خانے میں توکعبہ میں گاڑو برہمن کو

تذکرہ گلشن ہند میں عطا کاکوری نے انتہائی اہم اشعار نقل کئے ہیں ؎

کوئی تسبیح اورزنّار کے جھگڑے میں مت بولو
یہ دونوں ایک ہیں آپس میں،ان کے بیچ رشتہ ہے
دیروکعبہ پر ہی کیا موقوف شیخ و برہمن
کون سی جاہے جہاں جلوہ نہیں اللہ کا

ہندو جوگی اور مسلمان صوفی:

ہندو مذہب میں جولوگ روحانی پیشواہوتے ہیں انہیں جوگی کہا جاتا ہے یہ افراد اپنے دھرم کے مطابق طبقات انسانی کی تربیت واصلاح اور پاکیزگی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، ہندو جوگیوں اور مسلمان صوفیوں کا باہم رشتہ نہایت رواداراانہ اور وسیع المشربی کا امین نظر آتا ہے۔ان دونوں کے رشتہ نے ہندوستانی معاشرہ میں جہاں روحانی وعرفانی فضا استوار کی ہے، وہیں انہوں نے بہت ساری باہمی کشمکش اورمنفی رویوں کو بھی نابود کرنے میں اہم کردارادا کیا ہے چنانچہ ’’دبستان

مذاہب''میں ملا شیداء کی رائے ایک ہندو جوگی کے متعلق اس طرح لکھی ہے:

''ملا شیداء ہندی، جو کہ مشہور شاعروں اور اس دور کے فصحاء میں تھا، ایک دن راقم الحروف کے ساتھ گیانی زینہ کے مکان پر گیا اور اس کے ساتھ جلیس رہا، اس کے چیلوں اور اس کے گھر میں رہنے والوں کی وضع کو دیکھ بے حد خوش ہوا اور کہا: میری تمام عمر وارستہ لوگوں کی خدمت میں گزری لیکن میری آنکھوں نے اس پائے کا آزاد انسان نہ دیکھا اور نہ ہی میرے کانوں نے اس نہج کے کسی آزاد شخص کے بارے میں سنا۔''(۱)

اس طرح ہندو جوگیوں کی خدمت میں اورنگ زیب جیسا راسخ العقیدہ مسلمان بھی عقیدت سے حاضر ہوا تھا، اس واقعہ کو رقعات عالم گیری میں ذکر کیا گیا ہے۔(۲)

دبستان مذاہب کے مؤلف کی تحقیق کے مطابق یہ بھی مذکور ہے:

''ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے جو کوئی بھی ان کے مذاہب میں آنا چاہتا ہے، وہ اسے قبول کر لیتے ہیں، اور مانع نہیں ہوتے، ان کا کہنا ہے کہ مسلمان بھی بشن کی پرستش کرتے ہیں کیونکہ بسم اللہ کے یہی معنی ہیں، یعنی بشن کو بسم اللہ کہا جاتا ہے''۔(۳)

اس دور میں اس روحانی اشتراک کو فروغ دینے والے کئی صاحب فکر تھے، ان میں سے چندر بھان برہمن تھا جو دارا شکوہ کا منشی تھا اور فارسی کا پہلا

(۱) ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص:۳۶
(۲) ایضاً، ص:۳۷
(۳) ایضاً، ص:۳۶

صاحب دیوان ہندو شاعر تھا، داراشکوہ کی وفات کے بعد اس کے رفقائے کار اورنگ زیب کے دربار سے وابستہ ہوگئے، برہمن نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا، اور آخر عمر تک اس کا ملازم رہا، اس نے اورنگ زیب کی تعریف میں بڑے پرزور اشعار کہے۔ برہمن کی ایک صوفیانہ مثنوی ''مجموعۂ رسائل'' میں لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں شائع ہوچکی ہے۔ ''نازک خیالات'' نام سے اس کی دوسری تصنیف ہے، جو اس نے سوامی شنکر آچارج جی مہاراج کی سنسکرت تصنیف ''آتم بلاس'' سے ترجمہ کی تھی۔ یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں لاہور سے چھپ چکی ہے۔ (۱)

دبستان مذاہب کے حوالہ سے ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی کتاب ''ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر'' میں لکھا ہے:

> ''جو مسلمان بیراگیوں میں شامل ہوئے تھے وہ صرف جہلا نہ تھے، بلکہ ان میں بعض تعلیم یافتہ اور شریف زادے بھی تھے، چنانچہ بہت سے مسلمان ان کے مذہب میں داخل ہوگئے ہیں مثلاً مرزا صالح اور مرزا حیدر جو مسلمان شریف زادے میں بیراگی ہوگئے ہیں''۔ (۲)

مؤرخین نے لکھا ہے کہ بھوپت رائے نام کا ایک شاعر تھا، بے غم تخلص اور بیراگی لقب تھا، شاعری میں محمد افضل سرخوش کا شاگرد تھا اور بعد میں ''بندر ابن داس خوشگو'' کا تلمذ اختیار کرلیا تھا، طریقت میں شیخ الشیوخ محمد صادق اور نرائن داس بیراگی کا مرید تھا، اس کا تعلق کھتری قوم سے تھا، اس کے آباؤ اجداد ''سرکار جون'' جو (پنجاب میں تھی) کے قانون گو تھے جب اس پر جذبۂ عشق غالب ہوا تو علائق دنیا کو چھوڑ دیا، خوشگو کا بیان ہے کہ بے غم متعدد کتب کا مصنف

(۱) ایضاً ص:۳۷ (۲) ایضاً ص:۳۶

تھا''ہندوستان کے فقیروں کے قصے''اس نے ایک مثنوی کی صورت میں نظم کئے تھے۔اس کی فارسی کلیات میں پچاس ہزار اشعار تھے،ان میں ایک دیوان غزل اوررباعیوں کےسوا باقی مثنویاں ہیں۔اس کا انتقال ۱۷۲۰ء میں ہوا تھا۔(۱)

شیخ اکرام نے اس کے متعلق اپنی کتاب''رودِکوثر''میں لکھا ہے:

> ''نرائن پیراگی اور محمد صادق کے دوگونہ مواعظ سے اس کا قلب مجمع البحرین بن گیا تھا چنانچہ اس کی مثنویوں میں جابجا دورنگی موجوں کا سراغ ملتا ہے۔جن کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں اسلامی اور ہندوتصوف کا رنگ علیحدہ علیحدہ نظر آئے گا''۔(۲)

ہندودیوتاؤں کا احترام:

اسی طرح مسلمان ہندوؤں کے دیوتاؤں کا بڑا احترام کرتے ہیں اور بالخصوص رام چندر جی اور کرشن بھگوان کو انبیاء کا درجہ دیتے ہیں،مرزاعبدالقادر بیدل نے اپنی ایک نظم میں رام چندر جی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔نظیراکبر آبادی نے اپنی نظموں میں کرشن بھگوان اور شیو جی کی بھگتی کے گیت گائے ہیں مثلاً کنھیا جی کی راس، بلدیو جی کا میلہ،جنم کنھیا جی، بالپن بانسری بجیا، بانسری لہو ولعب کنھیا، کنھیا جی کی شادی اور مہادیو کا بیاہ، نیزنظیراکبرآبادی نے سکھوں کے پیشوا گرونانک کو بھی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ان کی بزرگی زہدوتقویٰ اورایک کامل فقیر کی حیثیت سے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔

ڈاکٹر محمد عمر نے شاہ عبدالعزیز کے حوالے سے نقل کیا ہے:

---

(۱) ایضاً،ص:۳۸

(۲) شیخ محمد اکرام،رودِکوثر،ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور،۲۰۰۳ء،ص:۴۰۵

''کسی مسلمان نے شاہ عبدالعزیز دہلوی سے ہندوؤں کے خالق کا نام دریافت کیا تو انہوں نے جواب میں کہا: ''الکھ اور پرمیشور اور کوئی دوسرا نام اس کی خصوصیت کی مناسبت سے، اس کے بعد اس شخص نے پوچھا کیا ہم مندرجہ بالا ناموں سے اللہ کو مخاطب کر سکتے ہیں؟ شاہ صاحب نے کہا: اس میں کوئی نقصان نہیں ہے۔''(۱)

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ''امرائے ہنود'' میں لکھا ہے کہ مولانا شاہ عبدالعزیز سے کنھیا جی کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

''بہتر تو یہ ہے کہ ان کے حق میں خاموش رہنا چاہئے لیکن بھاگوت سے جو ہندوؤں کی معتبر کتاب ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''کنھیا جی'' اولیاء میں سے تھے، اور ان کے مقام متھرا وغیرہ بلاشک عشق انگیز ہیں۔ یعنی ان مقاموں میں اللہ کا عشق جوش کرتا ہے۔''

''حضرت شاہ عبدالرزاق بانسوی نے بھی نہایت عمدہ بات لکھی ہے کہ جب میں کنھیا جی کے مقاموں میں سے ہو کر گزرا۔ ان کی روح میرے سامنے حاضر ہوئی اور پانچ اشرفیاں نذر کیں کہ مکیشر یعنی مکہ شریف کو آپ جاتے ہیں اس کو خرچ کیجئے۔ میں نے قبول نہ کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں اللہ کے سواء اور کسی سے مدد نہیں چاہتا، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ''کنھیا جی'' نجات والوں میں سے ہیں۔''

---

(۱) ایضاً، ص: ۴۵

مولانا عبدالعزیز صاحب لکھنوی ''بشارت احمدی'' کے مصنف اپنی کتاب کے آخر میں مسلمانوں کو درج ذیل نصیحت کرتے ہیں:

''راجہ رام چندر جی'' اور ''کنھیا جی'' وغیرہ اگلے بزرگوں کو برا کہنے سے توبہ کریں البتہ جو ہندوان کو خدا سمجھ کر پوجتے ہیں ان کے رسموں اور میلوں اور تماشوں سے لاکھوں کوس بھاگیں''۔(۱)

اسی طرح ہندو جوگی بھی اسلام کی تعلیمات، قرآن اور ذات محمدؐ سے عقیدت رکھتے تھے، ڈاکٹر محمد عمر نے لکھا ہے:

''راجہ چھتر سال اسلام اور آنحضرتﷺ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، وہ قرآن مجید کا اتنا ہی احترام کرتا تھا جتنا کہ وید اور پُران کا، اس کے دربار میں ایک طرف اونچی چوکی پر پُران اور دوسری جانب قرآن کریم رکھا جاتا تھا جس جانب قرآن رکھا ہوتا تھا، اس طرف علماء اور دوسری جانب برہمن بیٹھے تھے اور اس کی موجودگی میں مذہبی مسائل پر بحث ومباحثہ ہوا کرتا تھا اور اس طرح وہ دونوں مذہبوں کی تعلیمات سے فیضان حاصل کرتا تھا، خصوصاً توحید کے عنوان پر بحث ہوا کرتی تھی اپنے کلام میں چھتر سال نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت تعریف بیان کی ہے، اس کے مسلمان درباری راجہ کی موجودگی میں ''یا محمدی رسول اللہ'' کا ذکر جلی کرتے تھے اور کبھی کبھی راجہ بھی ان کے ساتھ ذکر میں

---

(۱) امرائے ہنود، ص:۳۰-۳۲

شریک ہوجایا کرتا تھااور بآواز بلندان الفاظ کودہراتا تھا۔''

سنیل داس مختار کوحضرت علی اوران کی اولاد سے بڑی عقیدت تھی، اس نے شاہ نجف کوخراج عقیدت پیش کیا ہے۔ بھگوان داس ہندی بھی آل رسول کا عقیدت مند تھا، اس نے سید خیرات علی کی فرمائش پر''سوانح النبوۃ'' لکھی تھی جس میں جناب رسالتمآب ﷺ اور بارہ اماموں کے حالات درج ہیں۔

''قصیدہ مشکل آسان'' میں بھگوان داس نے محمدؐ اور بارہ اماموں سے مشکل کشائی کی دعاء کی ہے۔''(۱)

درگا داس نے مذہبی اختلافات کے خاتمہ کے لیے جومثبت رائے پیش کی ہے اس کوبھی یہاں ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

''تمام مذاہب ومشارب کا آفریدگار وہی ایک ذات ہے جو عالم کو پیدا کرنے والا ہے اور ہر طبقہ کا پروردگار ہے، اس میں اس کی حکمت بالغہ اور مصلحت کاملہ ہے کہ اس نے ہر مذہب کے لیے اس کی حالت کی مناسبت سے جداگانہ طریقہ مقرر کیا ہے اور ہر ایک کے لیے خاص طور سے ہدایت فرمائی ہے۔ جس طرح کہ دنیا کے باغوں میں طرح طرح کے پیڑوں اور رنگ برنگ کے پھولوں سے رونق ہوتی ہے اسی طرح مختلف قسم کے مذاہب اور مشارب کے ذریعہ اس نے مختلف انداز میں دلوں میں اپنی شناسائی کا شور برپا کیا ہے۔ اگر مسجد ہے تو اس کی یاد میں اذان دی جاتی ہے۔ اگر بت خانہ ہے تو اس کی یاد میں جرس بجایا جاتا ہے۔ میری سمجھ میں

---

(۱) ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص: ۴۵۔۴۶

نہیں آتا کہ یہ کفر و دین کا جھگڑا کیا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ایک ہی چراغ سے کعبہ و بت خانہ روشن ہیں۔اس حالت میں انسان کو لازم ہے کہ اپنے دل کو کدورت کے زنگ سے صاف کر کے ہر مذہب اور ملت کے لوگوں کے ساتھ بھائیوں کا سا برتاؤ کر کے مخالفت کے خارزار سے اپنے کو علیحدہ کر کے اتفاق کے ماحول میں رہے، جب کسی مذہب کی عبادت گاہ میں پہنچے تو اس کی عزت واحترام کرے اور جب کسی کے بزرگوں کی خدمت میں جاوے تو ان کی تعظیم وتکریم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔دینی معاملات میں کسی سے مباحثہ نہ کرے اور ان بیکار جھگڑوں سے یگانگی کے تعلقات میں بیگانگی نہ پیدا کرے۔''(۱)

ان اقتباسات سے ملک کی سماجی اور ملی وقومی قدریں نہ صرف بحال ہوتی ہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ ایک دور تھا جب نہ کسی کو کسی کے مذہب سے شکایت تھی اور نہ باہم قومیں متنفر تھیں، بلکہ بڑے خوش مزاجی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اتحاد و اتفاق اور امن وامان سے رہتے تھے۔مگر اب صورت حال بہت ہی تشویشناک ہو چکی ہے۔اس کو فوری طور پر بدلنے کی ضرورت ہے تا کہ ہندوستانی معاشرہ اپنی عظمت رفتہ کو بحال کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

مسلم عہد حکومت میں ہندو لٹریچر کا فروغ:

ملک کی موجودہ صورتحال حد درجہ تشویشناک ہے۔اس کی متعدد وجوہات ہیں۔ان میں سب سے نمایاں وجہ یہ ہے کہ آج بڑی شدومد کے ساتھ اس بات کا

(۱) ایضاً،ص:۴۷

ڈھول پیٹا جارہا ہے کہ جب سرزمین ہندوستان میں مسلمان اقتدار پر قابض تھے تو انہوں نے ہندو رعایا کے ساتھ نہ صرف ناانصافی کی بلکہ ان کے ساتھ بھید بھاؤ کیا، مذہبی منافرت کو فروغ دیا، ان کی تاریخ وتہذیب، علوم وفنون اور زبان وادب کے ساتھ سوتیلا برتاؤ کیا۔ جبکہ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس الزام کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس طرح کی باتوں کو اس لیے رواج دیا جارہا کہ عوام میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کا ماحول پیدا ہو اور سیاسی عناصر اپنی اپنی سیاسی روٹیاں سینکیں۔ اگر ملک کے منظرنامے پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کی باتیں ہر طرف کی جارہی ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارے ملک کا میڈیا بھی اب اس طرح کے موضوعات پر بحث ومباحثہ کرانے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ نیز بعض سیاست داں بھی اپنی انتخابی ریلیوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت واشتعال انگیز بیانات دے کر عوامی سطح پر بدامنی اور نااتفاقی کو ہوا دے رہے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اس طرح کے لوگ نہ صرف سماجی رابطوں وتعلقات کو مخدوش کررہے ہیں بلکہ وہ ہندوستان کی تاریخ سے تجاہل عارفانہ برت رہے ہیں۔ چنانچہ سطور ذیل میں یہ بتانے کی سعی کی جائے گی کہ مسلم دور حکومت میں برادران وطن کی تہذیب وتمدن، علوم وفنون، تاریخ کے ساتھ کس قدر مشفقانہ اور روادارانہ برتاؤ کیا گیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوؤں کے مذہبی مصادر اور دیگر کتب سنسکرت میں ہیں۔ ہندوستان کے کئی علوم وفنون ایسے ہیں جن کو مسلمانوں نے اپنی قوم میں متعارف کرانے کے لیے سنسکرت سے عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح ان کے مذہب ودھرم کے متعلق معلومات حاصل کی گئیں۔ چنانچہ اس بابت، تزک جہانگیری، مآثر الامراء، آئین اکبری وغیرہ میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ دولت عباسیہ سے لے کر مغلوں کے دور تک مسلم حکمرانوں

نے ان کے علوم وفنون، تہذیب وتمدن اور دین ودھرم کی قدر کرنے کے ساتھ ان کو مناصب جلیلہ پر بھی فائز کیا۔ دولت عباسیہ میں مختلف زبانوں کے تراجم عربی میں کیے گئے۔ سریانی، عبرانی، قبطی، فارسی کلدانی فنیقی وغیرہ اسی طرح سنسکرت زبان کے ترجمہ کی ابتدا عباسی فرمانروا ابوجعفر منصور کے زمانے میں ہوئی۔ اسی نہج کو برقرار رکھتے ہوئے خلیفہ ہارون الرشید اور مامون الرشید نے بھی اپنے دور میں ہندوستان سے تعلقات بڑھائے۔ حتیٰ کہ ''ایک مرتبہ ہارون الرشید سخت بیمار ہوا اور پایہ تخت کے اطباء علاج سے عاجز آ گئے، اس زمانہ میں ہندوستان کے ایک پنڈت کی شہرت دور دور پھیلی ہوئی تھی، ابوعمرو عجمی کی تحریک سے ہارون الرشید نے اس کو طلب کیا اور اس کے علاج سے خدا نے شفا دی، اس فاضل کا نام منکہ تھا۔ وہ طبابت کے علوم عقلیہ کا بڑا ماہر تھا، بغداد میں رہ کر اس نے فارسی زبان سیکھ لی اور سنسکرت زبانوں کے ترجمہ کرائے۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ ہارون الرشید کے دربار کا ایک نامور پنڈت سالی تھا، جس کو عرب مصنف صالح لکھتے ہیں، اسی عہد میں ایک اور مشہور فاضل ہندو تھا جس نے سنسکرت کتابوں کے ترجمے کیے، اس کے باپ کا نام دھن تھا اور اہل عرب اس کو اس کے اصلی نام کے بجائے ہمیشہ ابن دھن یعنی دھن کا بیٹا لکھتے ہیں، برمکیوں نے بغداد میں جو ہسپتال بنایا تھا، یہ اس کا افسر تھا۔ جب مورخ مسعودی کھنمبات آیا اور وہاں کے حالات سے واقفیت پیدا کی تھی، وہ لکھتا ہے کہ ''یہاں کا راجہ مذہبی مناظرہ کا بہت شائق ہے اور مسلمان اور دوسرے مذہب کے لوگ جو اس شہر میں آتے ہیں ان سے بحث اور گفتگو کرتا رہتا ہے۔'' اسی طرح ابوریحان البیرونی نے بعض عربی تصنیفات کو ہندوؤں کے لیے سنسکرت زبان میں ترجمہ کیا، سنسکرت علوم وفنون کے متعلق جو کتاب اس نے لکھی

ہے اور جس کو جرمنی کے مشہور پروفیسر زخاو نے اپنی تصحیح سے چھپوایا ہے، یہ کتاب یقیناً سنسکرت علوم وفنون کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ مذکورہ تفصیل کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں میں سنسکرت بھاشا کی تعلیم کافی حدتک رائج ہوچکی تھی۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہوئی کہ دولت عباسیہ میں قائم بیت الحکمت میں باقاعدہ ایک شعبہ قائم تھا جس میں سنسکرت زبان کے تراجم کیے جاتے تھے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے نہایت توسع کے ساتھ ہندوستانی تہذیب اور ہندوؤں کے علوم ومعارف کو مسلم معاشرے میں رواج دیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے ان سنسکرت کتابوں کی فہرست بھی دی ہے جن کو ہندواہل علم نے تصنیف کیا اور بعد میں عربی زبان میں منتقل کی گئیں۔علامہ شبلی نعمانی کی تحقیق کے مطابق ایسی بیس کتب ہیں جو سنسکرت سے عربی میں منتقل ہوئیں۔موضوع کے تنوع اور علوم معارف کے تعدد کی وجہ سے ان کی اہمیت وافادیت سے انحراف نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ جب ہندوستان میں مسلمان اقتدار میں تھے تب بھی ہندوؤں کی مذہبی اور مختلف علوم وفنون پر مشتمل کتب کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ ہندوستان میں سلطان فیروز شاہ جب ۷۷۲ھ میں جوالامکھی کی سیر کو گیا تو معلوم ہوا کہ یہاں کے بت خانے میں ۱۳۰۰ سنسکرت کی قدیم تصنیفات موجود ہیں، فیروز شاہ نے وہ کتابیں حضور میں طلب کیں اور ان کے ترجمہ کا اہتمام کیا، نجوم کی ایک کتاب کا ترجمہ عزالدین نے نظم کیا اور دلائل فیروز نام رکھا، یہ کتابیں اکثر موسیقی اور کشتی فنون میں تھیں۔عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ ۱۰۰۰ھ میں جب لاہور پہنچا تو یہ ترجمہ شدہ کتابیں میری نظر سے گزریں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اکبر کو ہندوؤں سے خاصا لگاؤ تھا یہی

وجہ ہے کہ اس نے اپنے دربار میں بڑے بڑے قابل اور نامور پنڈتوں کو جمع کیا، ابوالفضل نے اپنی معروف کتاب ’’آئین اکبری‘‘ میں ان پنڈتوں کی فہرست دی ہے جن کو اکبر نے اپنے دربار میں بلایا اور مذہبی امور میں بحث ومباحثہ ومکالمہ پر مامور کیا۔ اکبر نے ملک میں ایک ممتاز ومنفرد انجمن بنائی جس میں تمام مذاہب کے علماء واسکالرس کو جمع کیا۔ اس کا بنیادی طور پر جو مقصد تھا وہ یہ کہ ملک میں رواداری کا رواج ہو، نیز تمام ادیان کے حاملین اپنے اپنے دین کا اتباع کرتے ہوئے باہم احترام سے رہیں۔ آج بھی ملک وعالمی منظرنامے پر ہمیں ان خطوط پر عمل کرنا ہوگا جو یکجہتی اور اتحاد و یگانگت کی علمبردار ہوں۔ اکبر کے دور اقتدار میں بہت سی سنسکرت زبانوں کے اردو تراجم بھی ہوئے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتاب مہا بھارت کا فارسی ترجمہ، عبدالقادر بدایونی و شیخ سلطان تھانیسری ونقیب خاں کی شرکت سے ہوا، اکبر نے اس ترجمہ کا نام رزم نامہ رکھا اور تمام معرکوں کی تصویریں بنوا کر اس میں شامل کیں، مذکورہ بالا فضلاء نے رامائن کا بھی ترجمہ کیا اور اس میں بھی تصویریں بنوائی گئیں، اتھر وید کا ترجمہ حاجی ابراہیم سرہندی نے کیا اور اس ترجمہ کا قلمی نسخہ شبلی کالج کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ لیلاوتی جو فن حساب کی مشہور کتاب ہے، اس کا ترجمہ فیضی نے کیا۔ تاجک جو علم نجوم میں ایک معتبر تصنیف ہے، مکمل خاں گجراتی نے اسے فارسی میں منتقل کیا۔ کنہیا جی کے حالات میں ہربنس ایک کتاب ہے، مولانا شیری نے اس کا ترجمہ کیا، نل اور دمن کا قصہ جو ایک پر درد ناول ہے، فیضی نے اس کو مثنوی کا لباس پہنایا۔ اکبر کی یہ بھی خدمت قابل تعریف ہے کہ اس نے سنسکرت سرمایہ میں بھی اضافہ کیا یعنی عربی فارسی کی بہت ساری کتابیں سنسکرت میں ترجمہ کرائیں، چنانچہ ’’زیچ میرزائی‘‘ کا ترجمہ

سنسکرت میں ہوا، اس ترجمہ میں فتح اللہ شیرازی، ابوالفضل، کشن جوتشی، گنگا دھر مہیش، مہانند، وغیرہ شامل تھے۔[۱]

ہندوؤں کے علوم وفنون کے متعلق شیخ اکرام نے بھی نہایت دلچسپ بحثیں کی ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کی بہت ساری سنسکرت زبان کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا گیا ہے اس بابت وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''ہندوستان کی پہلی کتاب جس کا عربی میں ترجمہ ہوا، ''سدھانت'' تھی۔ ۷۷۱ء میں سندھ کے ایک وفد کے ساتھ اور ریاضیات کا ایک فاضل پنڈت یہ کتاب لے کر بغداد پہنچا اور خلیفہ کے حکم سے ایک عرب ریاضی داں نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا۔ یہ علم ہئیت میں تھی اور عربی میں ''السند ہند'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسی طرح علم حساب میں بھی عرب ہندوستانیوں اور اہل مغرب، عرب سے مستفید ہوئے۔ عربوں کا بیان ہے کہ انہوں نے حسابی رقم (ہندسے) لکھنے کا طریقہ ہندوؤں سے سیکھا۔ اس لئے وہ ہندسوں کو حساب ہند یا ارقام ہندیہ کہتے تھے۔ علم طب پر بھی کئی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں۔ جن میں ''سشرت'' اور ''چرک'' کی کتابیں بہت مشہور ہیں۔ حکمت ودانش کی بھی کئی سنسکرت کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا ان میں سے ''کلیلہ ودمنہ'' اور ''بوذاسف وبلوہر'' دنیا کی اہم ترین

(۱) ندوی، سید سلیمان، (مولانا) مقالات شبلی، معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۹ء، جلد ششم، ص: ۸۷۔۸۸

کتابوں میں سے ہیں۔ ''کلیلہ ودمنہ'' ''پنج تنتر'' کا ترجمہ ہے۔ پہلے یہ کتاب سنسکرت سے فارسی میں ساسانیوں کے عہد حکومت میں منتقل ہوئی۔ پھر دوسری صدی ہجری میں عبداللہ بن المقفع نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا۔اصل فارسی ترجمہ تو کھو گیا لیکن عربی ترجمہ سلامت رہا۔اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب گوتم بدھ کی پیدائش،تربیت اور حکایات وتمثیلوں کے پیرائے میں ایک جوگی سے دنیا کے سربستہ رازوں پر اس کی گفتگو کا بیان ہے۔مذہبی حلقوں میں یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ عیسائیوں نے اس کو اپنے ایک مذہبی عالم سے منسوب کیا اور مسلمانوں کے ایک گروہ نے اسے اپنے امام کی تصنیف بتایا۔''رسائل اخوان الصفا'' میں جو چوتھی صدی کی نیم مذہبی ونیم فلسفیانہ تصنیف ہے۔اس میں اس کتاب کے کئی ابواب ہیں۔اس کے علاوہ عربوں نے بدھ مت کی کئی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔عرب مصنفین (مثلاً ابن ندیم،الاشعری،شہرستانی) کی تصانیف میں ہندوستانی مذاہب اور فلسفہ کے متعلق مستقل ابواب ہیں۔ان کے علاوہ اس زمانے کے اسلامی لٹریچر میں بدھ سادھوؤں اور یوگیوں کا ذکر بالوضاحت ملتا ہے۔''(۱)

---

(۱) شیخ محمد اکرام،آب کوثر،ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور،۲۰۰۶ء،ص:۳۲۔۳۵

اگر ہندوؤں کی تہذیب اور علم وفن کی قدر دانی اور ان کے مذہب کے احترام پر تمام شواہد وحقائق کا احاطہ کیا جائے تو کافی صفحات درکار ہوں گے، لہٰذا مذکورہ سطور سے یہ اندازہ ہوگیا کہ ہندو اہل علم اور ان کے علوم وفنون، نیز تہذیب کو مسلمانوں کے دور اقتدار میں کافی فروغ ملا۔

ہندو شعراء کا احترام:

ہندوؤں کی تہذیب اور ان کے تشخص کو برقرار رکھنے کی مسلم دور حکومت میں ہر ممکن سعی کی گئی، یہی وجہ ہے کہ مسلم دور حکومت میں ہندوؤں کی زبان سنسکرت اور عوامی زبان ہندی کو بڑی حد تک فروغ دیا گیا، مسلمانوں نے اس دور کے شعراء، ادباء، فصحاء اور مصنفین کا بھی احترام کیا، چنانچہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، سلاطین دہلی کی علم پروری اور علم دوستی کے حوالہ سے تحریر کرتے ہیں:

> ''اس دور میں مذہبی اور فلسفیانہ لٹریچر بکثرت لکھا گیا، گو یا وہ بہت اعلیٰ معیار کا نہیں ہے، رامانج نے برہمہ ستر کی تفسیر لکھی، پارتھ سارتھی نے کرم میمانسا پر کئی کتابیں لکھیں جن میں شاستر دیپکا اہم ہے، جے دیو نے بارہویں صدی میں اپنی مشہور کتاب گیت گوہ ند قلمبند کی۔ اس نے کئی ڈرامے ہر کیلی ناٹک، راج ناٹک، پرسن راگھو وغیرہ بھی لکھے، اس زمانہ میں ہندوؤں کی مشہور قانونی کتاب متا کشرا بھی تحریر کی گئی۔ جس کا مصنف وگیانیشور ہے، قانون کی ایک اور کتاب جموت واہین نے لکھی، اس دور کا مشہور مذہبی گرو بھسک اچاریہ ہے اس نے ہندو فلسفہ میں بھی کئی کتابیں تحریر کی۔ مثلاً یوگ واشسٹ اور نیایہ فلسفہ کی تفسیریں لکھی گئیں۔

ہندی لٹریچر کو بھی کافی فروغ ملا۔ پرتھوی راج کے درباری شاعر نے اپنی مشہور نظم پرتھوی راج راسو لکھی، ایک دوسرے شاعر سارنگ دھر نے دو بڑی نظمیں راجہ ہمیر کے بارے میں قلمبند کیں۔''(۱)

علاوہ ازیں کچھ ہندو شعراء فارسی کے بھی بڑے ماہر تھے، لہٰذا ان کا بھی مکمل احترام کیا جاتا تھا، ڈاکٹر محمد عمر نے لکھا ہے:

''عہد مغلیہ میں فارسی کے ہندو عالموں کی کمی نہیں ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں خاص طور پر ہندو مصنفین کے قلم سے فارسی زبان میں ہر فن کی تصانیف ملتی ہیں۔ اس عہد کے ہندو مؤرخین میں ہر چرن داس، جگ جیون داس، شیو پرشاد داس لکھنوی، لالہ رام رائے چتر من کائستھ، آنند رام مخلص اور کنور پریم کشور، فراقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ آنند رام مخلص (۱۷۵۱ء) اور ٹیک چند بہار کو فارسی زبان پر اتنی قدرت تھی کہ اول الذکر نے ''مرآۃ الاصطلاح'' اور آخر الذکر نے ''بہار عجم'' کے نام سے فارسی اصطلاحی لغات مرتب کیں۔''(۲)

ان ہندو شعراء کے طرز فکر کے متعلق بھی بڑی عمدہ بات کہی ہے:

''ان کا طرز فکر اور اندازِ بیان میں اس حد تک یکسانیت پائی جاتی تھی کہ اگر ہندو اور مسلمان شاعروں کے کلام میں سے ان کے تخلص نکال دیئے جائیں تو یہ امتیاز کرنا مشکل تھا کہ

---

(۱) ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک، ص:۴۶۹۔۴۷۲

(۲) ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص:۳۲

کون شعر ہندو کے قلم اور فکر سے نکلا تھا اور کون مسلمان کے قلم کا تھا۔‘‘[۱]

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی جو امتیاز خوبی ہے وہ باہم قوموں کا میل جول اور اشتراک وتعاون ہے، اہم بات یہ ہے کہ یہ وہ روایات ہیں جن پر کثرت سے مسلم اور ہندو عمل پیرا تھے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم آج ایسے ہندوستان میں سکونت پذیر ہیں۔ جس کی قدیم وجدید روایات اتحاد وامن اور باہمی رواداری جیسی مقدس قدروں کی امین و پاسبان رہی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گی۔

ہندوستان کا قدیم سیاسی نظام:

جس طرح مسلمانوں نے ہندوؤں کی زبان، دھرم اور تہذیب کو بلا کسی تعصب وجانب داری کے فروغ دیا۔ ٹھیک اسی طرح ہمارے مسلم سیاحوں، مصنفوں نے ہندوستان کی دیگر صفات وخصوصیات کو بھی بڑے اعتدال کے ساتھ پیش کیا۔ چنانچہ معروف سیاح مسعودی ہندوستان کے قدیم سیاسی وسماجی نظام پر رقمطراز ہے:

مسعودی کی تحقیق کے مطابق ہندوستان کا پہلا بادشاہ برہمن نسل سے تھا اس کے متعلق اہل ہند کی آراء متضاد ملتی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ ابوالبشر آدم علیہ السلام تھے اور بعض کا خیال یہ ہے کہ وہ بادشاہ ہی تھا۔ پہلے بادشاہ کے ہلاک (برہمن) ہو جانے کے بعد اہل ہند نے حد درجہ گریہ وزاری کی اور اس کا جانشیں اس کے سب سے بڑے بیٹے باہور کو بنایا جس کے لئے اس کا باپ پہلے ہی کہہ گیا تھا سیرت کے لحاظ سے اپنے باپ کی طرح تھا۔ اس نے حکماء کی بڑی توقیر کی بلکہ ان کے جاہ حشم میں اور اضافہ کیا اور انہیں اہل ہند کو حکمت کی تعلیم دینے پر مامور کیا

(۱) ایضاً، ص:۳۳

اور خود انہیں بھی علم وحکمت میں مزید تحقیق کا حکم دیا اس نے اپنے مذہبی عقائد کے مطابق بہت سی نئی عبادت گاہیں تعمیر کرائیں۔ جب وہ ہلاک ہوا تو اس وقت اس کی عمر سو سال تھی۔ اسی کے زمانے میں پانسہ پھینکنے کا رواج ہوا۔ باہور کے بعد زامان تخت نشیں ہوا اس کی حکومت تقریبا ۱۵۰ر سال پر محیط تھی۔ فارس اور چین کے بادشاہوں سے اس کی متعدد جنگوں کا ذکر علماء نے کیا ہے۔ اس کے بعد فور (پورس) مسند سلطنت پر متمکن ہوا اسی سے سکندر کی جنگ بھی ہوئی تھی۔ سکندر نے اسے شکست دے کر قتل کر دیا تھا اس وقت اس کی حکومت کے ۱۴۰ر سال گزر گئے تھے۔ اس کے بعد 'دِبشلیم' بادشاہ ہوا جس نے کتاب '' کلیلہ و دمنہ'' لکھی ہے۔ جسے ابن مقفع سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہی وہ کتاب جس کے بہت سے افسانے وغیرہ عباسی خلیفہ المامون کے کاتب سہل بن ہارون نے اپنی کتاب ''ثعلہ وعضرہ'' میں ترجمہ کر کے پیش کئے ہیں نیز ان پر کچھ اضافے کر کے کتاب کی منظومات میں مزید حسن پیدا کر دیا ہے۔ اس کی حکومت کی مدت تقریباً ۱۲۰ر سال ہے۔ پھر اس کے بعد بلہت ہندوستان کا راجا بنا۔ اس نے شطرنج کے کھیل کو ایجاد کیا۔ اس کا دور حکومت صرف ۳۰ر سال ہے۔ بلہت کے بعد کورش ہندوستان کا بادشاہ ہوا۔ اس نے معاشرتی اصلاحات کے علاوہ مذہبی روایات میں بہت ساری اصلاحات کیں اور اپنی رعایا کی بہت سی سماجی ومعاشی تکالیف رفع کرنے کا باعث بنا۔ کورش ہی کے زمانے میں سندباد بھی تھا جو اس کا مشیر تھا۔ اسی نے کورش کے لئے سات وزاراء، معلمین، غلام اور بیویوں کی تعداد کے سلسلے میں ایک کتاب مرتب کی تھی جس کا نام بھی اس کے نام پر سندبادہی تھا۔ اس نے کورش کے لئے جو سب سے بڑی کتاب لکھی تھی وہ مختلف امراض کے اسباب وعلل اور ان کے علاج کے لئے دواؤں کی تجاویز وغیرہ پر مشتمل تھی۔ اس میں جسم

انسانی کے مختلف اعضاء اور ان کی کارکردگی کے سلسلے میں اشکال وتصاویر دی گئی تھیں اس بادشاہ کی عمر اس کے انتقال کے وقت ۱۲۰؍سال تھی۔آگے مسعودی نے لکھا ہے کہ اس کے بعد اہل ہند اختلاف کے شکار ہو گئے اور لوگوں نے مرکز سے الگ الگ اپنی حکومتیں قائم کرلیں۔سندھ کی الگ، قنوج کی الگ حکومت قائم ہوئی کشمیر کی الگ حکومت قائم ہوئی سب سے بڑی حکومت کا پایہ تخت شہر''مانکیر'' تھا۔''(۱)

پتہ یہ چلا کہ ہندوستان کا قدیم زمانے سے ایک منظّم سیاسی نظام تھا۔ اور تمام اہل ہند اس کی تابع داری کرتے تھے۔اسی کے ساتھ ان بادشاہوں کی ایک اچھی عادت یہ تھی کہ وہ علم پروری کے بھی دلدادہ تھے۔اہل علم کی قدر ووقعت کرتے تھے۔نیز اہل علم کو جدید تحقیق کی راہ بھی ہموار کرتے تھے۔البتہ مسعودی نے اس بات کو قطعی نظر انداز کرڈالا ہے کہ ان بادشاہوں کا اپنی رعایا کے ساتھ رویہ کیسا تھا۔؟

ہندوستان کے قدیم حکماء کا فلسفہ:

مسعودی نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے پہلے بادشاہ کی نسل کے لوگ براہمہ کہلاتے ہیں۔ان کے سات پسندیدہ دانشور گزرے ہیں۔جن کا قول ہے کہ ہمارا وجود خالق کی حکمت پر مبنی ہے۔لہٰذا ہمارا عدم اس کی حکمت کے زوال یا نقص کا باعث ہوگا۔ان میں سے ایک دانشور کہتا ہے کہ ایسا کون ہے جو وجود عالم اور حقائق اشیاء کا کلی طور پر ادراک کرسکے؟ دوسرا کہتا ہے کہ عقل وحکمت کسی ایک شخص تک محدود نہیں ہوسکتی۔تیسرا کہتا ہے کہ ہمارے لئے انہی اشیاء کا ادراک کافی ہے جو ہمارے اجسام و اذہان سے قریب تر ہیں۔ چوتھا کہتا ہے کہ

(۱) مسعودی، ابوالحسن بن حسین بن علی، مروج الذھب و معادن الجوہر، مترجم پروفیسر کوکب شارانی، نفیس اکیڈمی، اسٹریچن روڈ کراچی، ۱۹۸۵ء، ج:۱،ص:۹۴۔۹۷

اشیاء کی معرفت ہمارے لئے اسی حد تک ضروری ہے جہاں تک ہمیں ان کی احتیاج ہو۔ پانچواں کہتا کہ ہمیں ان حکماء کی صحبت اختیار کرنی چاہیے جو حقیقت اشیاء کے ادراک پر قادر ہیں۔ چھٹا کہتا ہے کہ اس دنیا میں ہمارا وجود حصول سعادت نفس کے لئے وقف ہونا چاہئے کیونکہ یہاں سے ایک دن جانا ضروری ہے۔ ساتویں کا کہنا ہے کہ ہم نہ اپنی خوشی سے آئے ہیں نہ یہاں سے جانے پر ہمیں اختیار ہے۔ رہی زندگی تو اس میں پریشانیوں اور تکالیف کے سوا رکھا کیا ہے۔(۱)

خصائل ورسوم:

مسعودی نے لکھا ہے:

> ''ہندوستان میں شراب کی ممانعت ہے اور پینے والے کو سزا دی جاتی ہے لیکن یہ مذہبی نقطہ نظر سے نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے نزدیک شراب پی کر نشے کی حالت میں انسان عقل وخرد سے عاری ہو جاتا ہے اور اسے ملکی قوانین اور روایات کا پاس ولحاظ نہیں رہتا۔ البتہ حکمراں کے لئے سیاسی سوجھ بوجھ اور تدابیر ملکی پر غور وخوض کے لئے اس کا تھوڑا بہت استعمال صحیح سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں گانے بجانے کا رواج بہت ہے جس کے لئے انہوں نے بہت سے آلات بنا رکھے ہیں۔ گانا بجانا خوشی اور غمی دونوں میں ہوتا ہے نیز پڑوسیوں کے یہاں تقریبات کے موقعوں پر گانا بجانا ضروری ہوتا ہے۔''(۲)

---

(۱) ایضاً ص:۳۹۔۹۴

(۲) ایضاً ص:۹۹

مسعودی نے ایک رسم کے متعلق اور لکھا ہے:

''میں نے ارض ہند کے خطہ سراندیپ میں دیکھا اور وہ ایک سمندری جزیرہ ہے۔ کہ جب وہاں حکمراں فوت ہوجاتا تو اسے ایک خاص مقام پر لے جاتے ہیں جو اسی کام کے لئے مقرر ہے اور اس کی لاش وہاں رکھ دیتے ہیں۔ اس کی بیوی کے ہاتھ میں ایک پوٹلی ہوتی ہے جس میں سے مٹی نکال نکال کر وہ اپنے مردہ خاوند کے سر پر ڈالتی جاتی ہے اور کہتی جاتی ہے۔ ''اے لوگو! دیکھو یہ آج تک تمہارا حاکم تھا''۔ اس کا ہر حکم تمہارے لئے واجب العمل تھا اب اس نے دنیا چھوڑ دی اس لئے اس کے احکام بھی آج سے ختم ہوگئے کیونکہ ملک الموت نے اس کی روح قبض کر لی ہے۔ اگر چہ وہ زندہ ہوکر دوبارہ نہیں مرے گا لیکن اس کے مرنے سے تم نہ بدل جانا۔ اس قسم کے الفاظ وہ لوگوں سے نیک چلنی پر پابند رہنے کے لئے کہتی ہے۔ اس کے بعد تمام مذہبی رسوم ادا کر کے اس کی لاش کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ یہ رسوم ورواج آج بھی زندہ ہیں۔''(۱)

بہرحال یہ ان کے رسم ورواج ہیں جن پر ہم کو کوئی تعرض نہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ وطن عزیز تہذیبوں، ادیان اور ثقافتوں کا سنگم ہے۔ یہی ہمارے ملک کی اصل شناخت اور امتیاز ہے۔ یہ ہماری جمہوری اور آئینی قدروں کو یقینی بناتی ہیں۔

---

(۱) ایضاً ص: ۹۸-۹۹

مذکورہ شواہد کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ برادران وطن کے ساتھ ہمیشہ برابری اور انصاف و مساوات کا سلوک کیا گیا ہے۔ اس لیے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ملک میں باہم قوموں کے مابین بڑھتی خلیج کو مٹانے میں اہم کردار ادا کریں۔ اسی کے ساتھ ہمیں تاریخ کا مطالعہ بھی نہایت توسع اور فراخ دلی سے کرنا ہوگا تا کہ کسی رویہ اور کردار پر ہم الزام عائد نہ کرسکیں، جو لوگ تاریخ کے اوراق کو عوام الناس کے سامنے دھندلا کر کے پیش کررہے ہیں ایک بار انہیں بھی ان تمام حقائق پر نظر ڈالنے کی سخت ترین ضرورت ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موازنہ ادیان اور تہذیبی دریافت کے حوالے سے مسلم مفکرین وعلماء نے ہر دور اور ہر زمانے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مذکورہ مباحث کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے ادیان اور ان کی تہذیبوں کا مطالعہ مسلمانوں نے نہایت اعتدال اور غیر جانبدار ہوکر کیا ہے۔ آج ہمارے درمیان جو لوگ افتراق وخلیج پیدا کرنا چاہتے ہیں ان کو یہ بتانا کافی ہوگا کہ مسلمانوں نے غیر مسلم اقوام کے ادیان وتہذیب اور ان کے سیاسی وسماجی نظام کو جان کر مثبت پیغام دیا ہے۔ وہیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسالک وادیان کی خوشگوار روایت کو ایک درست سمت دینے میں مسلم علماء کی خدمات کو سراہنا اور انہیں بروئے کار لانا نہایت ضروری ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اب نفرت اور تشدد کی آندھی چل رہی ہے۔ لوگ باہم ادیان وتہذیب کے مابین غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں۔ ان کا سد باب اسی وقت ہوسکتا ہے جب ہم مکالمہ جیسی خوشگوار روایت کو فروغ دیں۔ سماجی طور پر نکتہ اتحاد پر عمل کریں۔

☆☆☆

باب دوم:
ہندوستان میں ہندو مسلم
اتحاد و یکجہتی کی روایات

ہندوستان جیسے تکثیری سماج میں اور موجودہ وقت میں ہندو مسلم تعلقات کی افادیت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا ہے، اگر ہم ملک کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے خمیر میں ہندو مسلم تعلقات کی خوشگوار روایتیں شامل ہیں۔ سماجی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے باہم دونوں قومیں ہمیشہ سیر وشکر رہی ہیں۔ سرزمین ہند کو یہ اولیت وفوقیت حاصل رہی ہے کہ ملکی نظام اور سماجی اداروں کی تنظیم وترتیب میں ہندو اور مسلمانوں نے مل کر بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کثیر لسانی اور متنوع افکار کے باوجود کبھی بھی کسی کو نہ کسی کے مذہب سے شکایت ہوتی تھی اور نہ کسی کو کسی زبان وتہذیب سے حتیٰ کہ ہندو راجاؤں کے دور میں جب بھی مسلم کمیونٹی پر ظلم وتعدی کو اختیار کیا گیا یا پھر مسلم حکمرانوں کے زمانہ میں ہندوؤں کے ساتھ ناروا سلوک کی آہٹ ہوئی تو ان شر پسند عناصر کے خلاف فوری کارروائی کی گئی اور مظالم کا سدباب بھی کیا گیا۔ سطور ذیل میں راقم ان روایات واقدار کو پیش کرے گا جو ہندو مسلم اتحاد کے لیے مشعل راہ ہیں۔ امید ہے ان تابناک روایات کو پڑھ کر دونوں قوموں میں جو غلط فہمی پھیل گئی ہے یا دانستہ طور پر پھیلائی جارہی ہے اس کو رفع کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

ہندوؤں کا مسلمانوں سے مشفقانہ برتاؤ:

شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب ''آب کوثر'' میں مستند حوالوں سے لکھا ہے:

> ''ہندوستان کے ساحل پر عربوں کی کئی بستیاں قائم تھیں۔ ''حجاج بن یوسف'' جب عراق کا گورنر مقرر ہوا تو ہاشمیوں کی ایک بڑی جماعت یہ علاقہ چھوڑ کر ہندوستان آ گئی۔ ان میں سے جو لوگ مغربی ساحل (بالخصوص کونکن کے کنارے) پر آ

بادہوئے ان کی اولاد کونوائت (نووارد) یانوائط، اور جولوگ راس کماری کے مشرق میں آباد ہوئے اور یہاں کی تامل عورتوں سے شادی کرکے ایک مخلوط قوم کے بانی ہوئے۔ انہیں لبی (**Labbes**) کہتے ہیں۔ چونکہ اس زمانے میں ہندو جہاز رانی کو پاپ سمجھتے تھے، اس لیے ان لوگوں نے جہاز رانی اور تجارت سے اپنے نئے وطن میں عزت و وقار حاصل کرلیا۔ نوائط بالعموم شافعی مذہب کے پیرو ہیں اور ان میں سے کئی بڑے عالم پیدا ہوئے ہیں۔ بالخصوص مخدوم علی مہائمی جن کا مزار بمبئی کے قریب قصبہ مہائم میں ہے۔ ہندوستان کے بڑے علماء میں شمار ہوتے ہیں''۔ (۱)

جومسلمان ساحل گجرات پرآباد تھےان کے متعلق، عرب سیاح سلیمان اور مسعودی نے لکھا کہ ہے کہ یہاں دونوں قوموں کے باہم تعلقات نہایت خوشگوار تھےاور یہاں کے ہندوراجاؤں کومسلمانوں سے محبت تھی۔ شیخ محمد اکرام نے اپنی تصنیف آب کوثر میں بھی عوفی (یہ التمش کے دور میں ہندوستان آیا تھا) کی کتاب "**جامع الحکایات و لامع الروایات**" کےحوالے سے پٹن (پٹن ایک وقت میں گجرات کے راجاؤں کا دارالحکومت ہوا کرتا تھا جسے نہروالہ پٹن کہتے ہیں۔ اس سے قبل و کبھی پور ہوتا تھا) کے ہندو راجاؤں کا مسلمانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کوذکر کیا ہے:

''وہ لکھتا ہے (یعنی عوفی اپنی کتاب جامع الحکایات و لامع الروایات میں)''ایک مرتبہ کھنبائت جانے کا اتفاق ہوا جو

(۱) شیخ محمد اکرام، آب کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۲۰۰۶ء، ص: ۴۱۔۴۲

سمندر کے کنارے ایک شہر ہے اور وہاں دیندار مسلمانوں کی ایک جماعت آباد ہے۔ یہاں میں نے سنا کہ راجا جنک کے زمانے میں مسجد تھی۔ اس کے ساتھ ایک مینار تھا جس پر چڑھ کر مسلمان اذان دیا کرتے تھے۔ پارسیوں نے ہندوؤں کو بھڑکا کر مسلمانوں سے لڑوایا۔ امام نے یہ حال دیکھ کر خود ایک دن موقع پا کر جبکہ راجا ہاتھی پر سوار ہو کر باہر جا رہا تھا۔ ایک نظم کی صورت میں سارا واقعہ سنایا۔ راجہ نے اس پر اپنے درباریوں سے تو کچھ نہ کہا لیکن انہیں اطلاع دیئے بغیر خود بھیس بدل کر کھنبائت گیا اور سب باتوں کی تحقیق کی۔ واپس آ کر اس نے دربار منعقد کیا۔ اپنی تفتیش کا حال بتایا اور حکم دیا کہ پارسیوں اور ہندوؤں میں سے ان سب کو جو مسلمانوں پر ظلم کے مرتکب ہوئے تھے سزا دی جائے۔ اور مسلمانوں کو ایک لاکھ بالوٹرا (گجراتی سکے) تاوان ملے تا کہ وہ مسجد اور مینار نئے سرے سے تعمیر کریں۔ ایک اور خصوصیت یہاں کے راجہ کی تھی وہ یہ مسلمانوں کے معاملات ان کا اپنا آدمی فیصلہ کرتا تھا جسے ہنرمند کہا جاتا تھا۔ بڑے شہروں میں جہاں مسلمانوں کی زیادہ آبادی تھے ہندو راجاؤں نے سرکاری طور پر ہنرمند متعین کر رکھے تھے''۔[1]

مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کی رواداری اور مشفقانہ برتاؤ کی ایک مثال شیخ محمد اکرام نے ''تحفۃ المجاہدین'' (اس کتاب کو وسط عہد اکبری میں شیخ زین الدین

(۱) ایضاً ص: ۴۳-۴۴

نے اس وقت تصنیف کیا جب پرتگیز مالابار کے مسلمانوں پر ظلم وتعدی اپنا رہے تھے۔اس کتاب کے پہلے تین ابواب میں جہاد کے احکام، مالابار میں اشاعت اسلام کا ذکر اور یہاں کی ہندو اقوام کی عادات و مراسم کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں پرتگیز یوں کے مظالم کا تفصیلی ذکر موجود ہے) کے حوالے سے لکھا ہے:

''تیسری صدی ہجری میں جب مسلمان درویشوں کی ایک جماعت لنکا میں حضرت آدمؑ کے نقش قدم کی زیارت کے لیے جارہی تھی تو باد مخالف ان کا جہاز مالابار کے شہر کدنکلور (کدنگانور) کے ساحل پر لے گئی۔ وہاں کے راجا یمورن (سامری) نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ان سے ان کے مذہب کا حال دریافت کیا اوران کے بیان سے اتنا متاثر ہوا کہ جب زائرین لنکا سے واپس آئے تو وہ اپنی حکومت اپنے سرداروں کے سپرد کرکے خود ان کے ساتھ عرب چلا گیا۔ وہاں اس کی وفات ہوگئی لیکن مرنے سے پیشتر اس نے عرب درویشوں سے کہا کہ ملیبار میں اسلام پھیلانے کی صورت یہ ہے کہ تم لوگ ملیبار سے تجارت اور سوداگری کا کام شروع کرو،اوراپنے امراء کے نام ایک وصیت نامہ لکھ کر دیا کہ ان پردیسی سوداگروں سے لطف و محبت کا سلوک کرنا۔ چنانچہ انہوں نے نو وارد عربوں سے یہی سلوک کیا اور وہاں کثرت سے عرب سوداگر آنے جانے اور رہنے سہنے لگے۔''(۱)

اسی طرح ایک اور واقعہ ابن بطوطہ کے حوالے سے شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

(۱) ایضاً،ص:۴۵

> ''جب ابن بطوطہ نے آٹھویں صدی ہجری میں کھنبائت سے چین کا سفر کیا۔ تو اس نے مالابار کے ساحل پر جا بجا مسلمانوں کی معقول آبادیاں دیکھیں۔ ضلع کاروار صوبہ بمبئی کی قدیم بندرگاہ ''ہونادر'' میں سلطان جمال الدین ایک ہندو راجہ کی طرف سے حکمراں تھے اور اس شہر میں کئی مسلمان عالم اور اسلامی مدارس موجود تھے۔ منگلور میں مسلمانوں کی آبادی چار ہزار کے قریب تھی۔ کالی کٹ کا راجہ ہندو تھا، لیکن سوداگروں اور تاجروں کا سردار مسلمان تھا اور بحری تجارت میں انہیں بڑا دخل تھا''۔ (۱)

معبر ایک ساحلی خطہ ہے۔ اس کا وقوع مشرقی ساحل پر راس کماری کے شمال مشرق کی طرف کارومنڈل پر ہے۔ جسے معبر کہا جاتا ہے۔ اس علاقے میں مسلمانوں کی قدیم بستیاں تھیں۔ سب سے اہم اور پرانی بستی ''ٹنے ولی'' صوبہ مدراس کا شہر ''کیالا پٹم'' ہے۔ کیالا پٹم کی آبادی گزیٹر کی رپورٹ کے مطابق تیرہ ہزار کے قریب تھی اور اس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ مشہور ہے کہ پانڈیا خاندان کے راجاؤں نے نو وارد عربوں کو چار میل لمبا اور ڈیڑھ میل چوڑا علاقہ دیا اور یہاں انہوں نے اپنی بستیاں آباد کیں۔ اور یہاں کی مقامی عورتوں سے شادیاں کیں اور آہستہ آہستہ اس علاقے میں کافی اثر حاصل کر لیا۔ نیز مسلمان ضلع ''ٹنے ولی'' کی کل آبادی کا چھ فی صدی ہیں اور تین تحصیلوں میں دس فی صدی ہیں۔ اس علاقے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات خوشگوار ہیں۔ پوٹن پودار (**Pottanpodar**) کی مسجد کی نسبت لکھا ہے کہ وہاں ہندو زائرین

---

(۱) ایضاً، ص: ۴۷

کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ شیخ اکرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہاں کی مزارات کا ہندو احترام کرتے ہیں اور مسجدوں کے تبرکات بڑی شوق سے لیتے ہیں۔[1]

مذکورہ شواہد وروایات کی روشنی میں یہ پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو راجاؤں نے نہ صرف حسن سلوک اور توازن واعتدال کا رویہ اختیار کیا بلکہ انہیں رہنےسہنے اور اسلامی ثقافت کے فروغ کے مواقع بھی عطا فرمائے۔ اس طرح ان کو تجارت کے مواقع بھی فراہم کئے۔ ان حقائق سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں دونوں قومیں باہم مل کر رہتی تھیں۔ افکار وعقائد اور تہذیب وثقافت کے متغایر ہونے کے باوجود دونوں برادریوں کے خوشگوار تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ آج بھی ہمیں ضرورت ہے کہ ہم ماضی کی روشن وتابناک روایتوں کو فروغ دیں اور ملک میں ایسے خطوط متعین کریں جن سے باہم طبقات انسانی کے رشتے مستحکم ہوسکیں۔

مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ حسن سلوک:

محمد بن قاسم نے ہندوستان میں ۷۱ ھ میں قدم رکھا اس پر عام طور سے یہ الزام ہے کہ اس نے سندھ کے ہندوؤں کے ساتھ برا سلوک کیا۔ اس طرح کی روایتیں چچ نامی وغیرہ میں ملتی ہیں۔ ان روایتوں کے متعلق اہل علم نے اطمینان کا اظہار نہیں کیا ہے۔ لہٰذا محمد بن قاسم پر ہندوؤں کے ساتھ زیادتی اور ظلم کا الزام لگانا مناسب نہیں ہے کیونکہ مورخین نے جو واقعات درج کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے تمام طبقات کے ساتھ برابری کا رویہ اپنایا۔ اس بابت شیخ اکرام نے اپنی کتاب ''آب کوثر'' میں لکھا ہے:

(۱) ایضاً، ص: ۴۹۔۵۰

'' اہل سندھ سے بڑی نرمی کا برتاؤ کیا۔ جن لوگوں نے اطاعت قبول کر لی، انہیں کسی طرح تنگ نہیں کیا بلکہ ہر طرح امان دی۔ ہندوؤں کو وہ مراعات عطا کیں جو بعض فقہاء کے نزدیک اہل کتاب کے لئے مخصوص تھیں اور ایسے نظم ونسق کی بنیاد رکھی جو پہلے راجاؤں سے یقیناً بہتر تھا۔ شیخ محمد اکرام نے داہر کے باپ راجہ چچ کے متعلق ایک اقتباس ڈاکٹر تارا چند کی معروف کتاب تاریخ اہل ہند سے نقل کیا ہے۔ چچ ایک متعصب حاکم تھا۔ اس نے اپنی رعایا کے ایک حصے کے لئے سخت جابرانہ قوانین نافذ کیے۔ انہیں ہتھیار رکھنے، ریشمی کپڑے پہننے، گھوڑوں پر زین ڈال کر سوار ہونے کی ممانعت کر دی اور حکم دیا کہ وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر اور کتوں کو ساتھ لیکر چلا کریں۔ محمد بن قاسم کے متعلق وہ لکھتے ہیں، مسلمان فاتح نے مفتوحوں کے ساتھ عقلمندی اور فیاضی کا سلوک کیا۔ مالگزاری کا پرانا نظام قائم رہنے دیا۔ قدیمی ملازموں کو برقرار رکھا۔ ہندو پجاریوں اور برہمنوں کو اپنے مندروں میں پرستش کی اجازت دی اور ان پر فقط ایک خفیف سا محصول عائد کیا جو آمدنی کے مطابق ادا کرنا پڑتا تھا۔ زمینداروں کو اجازت دی گئی کہ وہ برہمنوں اور مندروں کو قدیم ٹیکس دیتے رہیں۔ آگے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم نے پرانے نظام کو حتی الوسع تبدیل نہ کیا۔ راجا داہر کے وزیر اعظم کو وزارت پر برقرار رکھا اور اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے تمام نظام سلطنت

ہندوؤں کے ہاتھ میں رہنے دیا۔عرب فقط فوجی اور سپاہیانہ انتظام کے لئے تھے۔مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ قاضی کرتے تھے، لیکن ہندوؤں کے لئے ان کی پنچائتیں بدستور قائم رہیں۔محمد بن قاسم کی یہی رواداری اور انصاف تھا جس کی وجہ سے اس کی مخالفت کم ہوئی۔کئی شہروں نے خود بخود اطاعت قبول کر لی۔علامہ بلاذری نے تو ''فتوح البلدان'' میں یہاں تک لکھا ہے کہ جب محمد بن قاسم قید ہوکر عراق گیا تو ہندوستان کے لوگ روتے تھے اور کیرچ (علاقہ کچھ) کے لوگوں نے تو اس کا مجسمہ بنایا۔''(۱)

محمد بن قاسم کے حسن سلوک اور توازن واعتدال نے یقیناً وہاں کی ہندو رعایا پر مثبت اثر ڈالا ہوگا جس کی وجہ سے یہاں کی ہندو رعایا اس کے متوازی کارناموں کو پسند کرتی تھی۔آج بھی اسی حسن سلوک اور مثبت کردار کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

بھگتی تحریک:

لودھیوں کے دور حکومت (۱۳۲۱-۱۵۲۶ء) میں بھگتی تحریک کا ظہور ہوا اس تحریک کے متعلق شیخ محمد اکرام نے درج ذیل تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ ہندوستان میں کئی ایسے بزرگوں کا ظہور ہوا جنھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے عقائد کو ملانا چاہا اور ایسے فرقوں کا آغاز کیا جن میں دونوں مذہبوں کے عقائد شامل تھے۔ان بزرگوں میں کبیر سب سے پہلے تھے۔جو ۱۴۴۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۱۸ء میں وفات پائی۔تذکرہ اولیاء میں انہیں شیخ کبیر جولاہہ قدس سرہ لکھا

---

(۱) آب کوثر،ص:۲۵-۲۷

ہے اور کہا ہے کہ یہ حضرت تقی سہروردی کے خلیفہ تھے اور تمام موحدان وقت سے ممتاز تھے۔ چند روز رامانند بیراگی کی خدمت میں رہ کر فن شاعری زبان ہندی میں حاصل کی۔ ہندی زبان میں پہلے معرفت انہوں نے بیان کی۔ ان کی تقلید گرونانک نے کی، کبیر صاحب نے بعد اس کے حضرت شیخ بھیکا چشتی کی خدمت میں رہ کر خلافت حاصل کی اور ہندو مسلمان دونوں گروہ آپ کے معتقد تھے۔ ہر ایک آپ کو اپنے میں شمار کرلیا کرتا تھا اور جو اہل ہنود آپ کے سلسلے کے ہیں وہ کبیر پنتھی کہلاتے ہیں۔ طریق ان کا اذکار و اشغال میں بالکل اہل اسلام کے مطابق ہے۔ مگر الفاظ کا فرق ہے۔ ان چیزوں کی وجہ سے اسلام نے جو اثر ہندو عقائد پر کیا اس کا ذکر تاراچند کی کتاب تاریخ ہند کے حوالے سے شیخ اکرام نے ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ جنوب میں جہاں مسلمان پہلے بسے، ہندوؤں کے مذہبی و معاشرتی خیالات میں تبدیلیاں شنکر اچاریہ، شیو اور وشنو مت کے سادھوؤں کی وجہ سے تھیں۔ رامانج نے ان کا خاص اسلوب ترتیب دیا۔ اور بھگتی تحریک کو اس کے فلسفے سے ایک بنیاد مل گئی۔ اس کے پیروؤں نے اس تحریک کو تمام ہندوستان میں پھیلا دیا۔ بھگتی یا پریم اور عبادت کا مذہب جو آہستہ آہستہ شمال اور جنوب کے تمام ہندوؤں میں پھیل گیا۔ ایک لحاظ سے اپنشد اور بھاگوت گیتا کی تعلیمات پر مبنی تھا۔ لیکن ازمنہ وسطی میں اس کی مقبولیت اسلامی اثرات کی وجہ سے ہوئی۔ بھگتی تحریک کے پرانے پہلوؤں پر اسلامی اثرات کی وجہ سے زیادہ زور دیا جانے لگا اور کئی پہلو تو اسلام سے اخذ کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ مولانا نجیب اشرف کے حوالے سے لکھا ہے کہ اشاعت اسلام کا کام صوفیوں نے (جو باہمہ و بے ہمہ کی زندہ مثال، وسیع المشرب آزاد خیال اور روادار ہوتے تھے) شروع کیا۔ ہندوؤں نے بھی اس رنگ کو اختیار کرلیا۔ رامانند، گرونانک، سوامی

چشتیہ اسی قسم کے گروتھے۔انہوں نے نہ صرف ''ویدانتی توحید'' اور متصوفانہ ''فنافی اللہ'' کے اصول کو عام کردیا۔ بلکہ اپنی برادری میں داخل ہونے کے لئے ہندو و مسلمان کی قید بھی اٹھادی اوراس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے معتقدین میں نہیں، بلکہ خلفاء میں ہم کو مسلمان نظرآتے ہیں۔کبیر پنتھی، داؤد پنتھی اس کی زندہ مثالیں ہیں۔[1]

اس ضمن میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ لودھی دورحکومت میں رواداری اور باہمی رکھ رکھاؤ کا فروغ بڑی حدتک ہوا۔تاہم بھگتی تحریک کے فلسفہ پراعتراض کیا جاسکتا ہے۔لیکن یہاں اس کے نظریاتی پہلوؤں کونظرانداز کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالنا نہایت درست ہوگا کہ ہندو مسلم اس حدتک معتدل تھے کہ ہندوؤں نے اپنے متصوفانہ اسلوب میں اسلامی تعلیمات کو بالکل رچالیا تھا۔اسی طرح یہ بات بھی نکل کر سامنے آتی ہے کہ جب اس حدتک اتحاد تھا تو دیگر معاشرتی اور تمدنی پہلوؤں میں بھی بہت حدتک یکسانیت ہوگی۔

مسلم حکمرانوں کا طریقۂ حکومت:

اکبر نے زمام اقتدار۱۵۵۶ء میں سنبھالی۔یہ سب جانتے ہیں کہ اکبر کے دور میں اسلام بہت کمزور ہوا۔اس کی مورخین نے متعدد وجوہات لکھی ہیں البتہ اس نے نظام حکومت چلانے کے لیے صلح کل کا طریقہ اختیار کیا۔اس طریقے پر بھی بہت سے لوگوں نے تنقیدیں کی ہیں۔ان تمام باتوں کو یہاں ترک کیا جارہا ہے۔البتہ اکبر کے اس نظام حکومت کے متعلق شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

> ''صلح کل جس کی جہانگیر نے اتنی تعریف کی ہے، اسلامی ہندوستان کی تاریخ میں بالکل نئی چیز نہ تھی۔جہاں تک مختلف

(۱) آب کوثر،ص:۴۶۵۔۴۶۶

مذاہب کے ساتھ رواداری اور سب طبقوں کو حکومت میں حصہ دینے کا تعلق ہے، فاتح سندھ محمد بن قاسم نے اس پر پوری طرح عمل کیا۔ کشمیر میں سلطان زین العابدین کا عہد حکومت طریق صلح کل کے لئے یادگار ہے۔ فرق کمی اور بیشی کا تھا۔ بلاشبہ اکبر نے اسے بڑی وسعت دی اور اپنی حکومت کے آغاز سے اس پر عمل پیرا ہوا۔ پہلی راجپوت شہزادی سے شادی ۱۵۶۲ء میں ہوئی۔ راجا بھگوان داس اور راجا مان سنگھ کو اعلیٰ مناصب اس کے فوراً بعد ملے۔ جزیہ ۱۵۶۴ء میں بر طرف ہوا۔ یاترا ٹیکس بھی اگلے سال موقوف ہو گیا۔ دربار میں اس وقت مخدوم الملک اور صدر الصدور کا زور تھا۔ لیکن ان کی طرف سے کسی مزاحمت کا بدایونی یا کسی اور مورخ نے ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ صلح کل کی پالیسی سے مسلمانوں کو نظام حکومت میں جو اہمیت حاصل تھی اس میں کسی قدر کمی ہو گئی اور ایک حد تک غیر مسلم بھی شریک حکومت ہو گئے۔ اس سے بعض پیچیدگیاں بڑھیں اور ہندوؤں نے اطراف ملک میں اسی پالیسی کا کس طرح ناجائز فایدہ اٹھایا۔ لیکن چونکہ یہ اقدامات زیادہ تر سیاسی اور انتظامی تھے، مذہبی نہ تھے۔ اور اسلامی ہندوستان کی تاریخ میں، (مثلاً شیر شاہ سوری اور اس کے جانشینوں کے عہد میں) ہندوؤں کو اعلیٰ عہدے دیے جانے کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ اس لیے ان اقدامات کی مسلمان امراء یا علماء نے مخالفت نہ کی اور صلح کل کا طریقہ

مغل نظام کا جزو ہوگیا، جوتغیر وتبدل کے ساتھ اکبر کے بعد
بھی جاری رہا۔''(۱)

یہ کہا جاسکتا ہے کہ اکبر کی پالیسی تمام رعایا کو ساتھ لیکر چلنے کی تھی، اس کا نظریہ تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کو بھی اعزاز اور مناصب جلیلہ پر فائز کیا جائے تا کہ معاشرہ پرامن رہ سکے اور ملک میں کسی بھی طرح کی بدامنی فرونہ ہونے پائے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر نے صلح کل کا جو طریقہ اپنایا تھا وہ کوئی معیوب نہ تھا بلکہ اس سے قبل بھی اس طرح کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ آج بھی ضرورت ہے کہ صاحب اقتدار اسی پالیسی کو اپنا نصب العین بنائیں تا کہ کسی کے ساتھ عدم رواداری اور ناانصافی نہ ہوسکے۔

ان تمام تاریخی دستاویزات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ تمام طبقات کے ساتھ برادرانہ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ عام طور سے آج مسلم حکمرانوں پر یہ اعتراض عائد کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کے مخالف تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کی سرکوبی کی۔ جبکہ حقائق اس کے برعکس ہیں۔ سچ یہ ہے کہ یہ اعتراض سیاسی ملغوبہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ کوئی بھی شخص مسلم حکمرانوں کے دور میں صادر ہونے والے واقعات کا تعصب کی عینک ہٹا کر مطالعہ کرے گا تو یقیناً وہ ضرور اس بات کا قائل ہوگا کہ مسلم حکمرانوں نے بڑی توسع اور رواداری کا مظاہرہ کیا۔ ان کی تہذیب، دین دھرم اور زبان وادب کے فروغ کے مواقع فراہم کئے۔ آج بھی اسی روایت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔

---

(۱) شیخ محمد اکرام، رود کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور، ۲۰۰۵ء، ص: ۸۵۔۸۶

مسلم دورِحکومت میں ہندو احیائی تحریکیں:

مغل سلطنت میں ایک تحریک ایسی رونما ہوئی جس نے بنگال کے مسلمانوں پر بہت اثر ڈالا۔ چیتنیہ تحریک یا وشنو تحریک، چیتنیہ کے متعلق شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

''اس کی پیدائش ۱۴۸۶ء کو ہوئی، اس نے بعد میں مسلمان پیروں سے مسئلہ توحید پر بحث کی۔ اس کے طریقے میں کئی چیزیں ایسی ہیں جن میں شاید صوفیا کے طریق کار کو دخل تھا۔ اس کے قریبی اور با اثر ساتھیوں میں کم از کم ایسے تھے جو فارسی اور عربی کے ماہر اور بنگال کے مسلمان بادشاہ کے دربار میں دو بڑی باعزت اسامیوں پر مامور تھے۔ روپ اور سناتن دو برہمن بھائی تھے۔ ویشنو تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ان دو بھائیوں کی شہرت اکبر تک پہنچی اور اس نے ۱۵۷۳ء میں متھرا آ کر ان سے ملاقات کی۔ (گرچہ اکبر کی اس ملاقات کے سلسلے میں مورخین نے اختلاف کا اظہار کیا ہے) لیکن یہ بات درست ہے کہ بنگالہ کا مغل صوبیدار مان سنگھ ان کا بڑا معتقد تھا۔ اور سر جادو ناتھ سرکار کہتے ہیں کہ چیتنیہ کی تحریک کو راجستھان کے راجپوت خاندان سے بڑی مدد ملی۔ وِرِنداون میں اس زمانہ میں جو سر بفلک مندر تعمیر ہوئے ان میں سب سے بڑا پرشکوہ (گوبند جی کا مندر) مان سنگھ نے ایک کروڑ روپیہ کی لاگت سے تعمیر کرایا اور مندر کے ایک سنسکرت کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مندر ۱۵۹۰ء میں مہاراجا

پرتھوی راج کی نسل کے راجا مان سنگھ نے اپنے گرو روپ اور سناتن کی زیر ہدایت تعمیر کرایا۔''(۱)

چیتنیہ کی تحریک کا مسلمانوں پر جو اثر ہوا اس کے متعلق شیخ اکرام نے لکھا ہے کہ:

''اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ تحریک بابا نانک کی تعلیمات کی طرح ہندو مذہب اور اسلام کو ملانے کی ایک کوشش تھی۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس تحریک کا مقصد کبیر مت یا ابتدائی سکھ مذہب کی طرح ہنود اور مسلمانوں کو ملانا نہیں تھا، بلکہ ہندو مذہب کا احیاء تھا اور اس مقصد میں یہ تحریک اس حد تک کامیاب ہوئی کہ نہ صرف بنگال میں اشاعت اسلام رک گئی، بلکہ بعض مسلمانوں نے ویشنو مذہب اختیار کر لیا اور عامۃ المسلمین اور وسطی اور شمالی بنگال کے ان پڑھ اور غریب مسلمانوں کے عقائد و اطوار میں ہندو طریقے داخل ہو گئے۔''(۲)

ویشنو تحریک کے متعلق شیخ اکرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس تحریک کا مقصد فقط دفاعی نہیں بلکہ جارحانہ تھا۔ اس نے فقط ہندوؤں کو مسلمان ہونے سے نہیں روکا، بلکہ مسلمانوں میں ویشنو مت کی اشاعت کی۔ اور اس میں اسے خاصی کامیابی ہوئی، چیتنیہ نے خود بعض مسلمانوں کو ارتداد کا راستہ دکھایا۔ اس کا ایک قریبی ساتھی ''ہری داس'' پہلے مسلمان تھا اور قاضیوں کے خاندان سے تھا۔ اسی طرح ''بجلی خان'' ایک افغان سورما اس کے ہاتھ پر وشنو ہوا۔ شیا مانند نے کثرت سے مسلمانوں میں پرچار کیا اور کامیاب رہا۔ اس نے اس مقصد کے

---

(۱) رود کوثر، ص: ۴۹۴۔۴۹۵

(۲) ایضاً، ص: ۴۹۳

لئے اقتصادی حربے بھی استعمال کئے اور راجا نارائن گڑھ سے کہا کہ مسلمان مزدور جب تک اپنا مذہب ترک نہ کریں انہیں کام نہ دیا جائے۔ نچلی ذاتوں میں یہ سلسلہ بہت وسیع تھا۔

مسلمانوں کو پورا ویشنو بنانے کے علاوہ ویشنو طریقے کی کئی شاخیں ایسی شروع ہوئیں، جن کا مقصد مسلمانوں کو ویشنو سلسلے سے منسلک کرنا تھا ایک گروہ درویشی تھا جو سناتن سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ایک نہایت وسیع سلسلہ ''باؤل'' فقیروں کا تھا، جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ فرقہ تھا''۔ (۱)

اس تحریک کے متعلق شیخ اکرام مزید لکھتے ہیں:

> ''ویشنو تحریک نے ادب کے ذریعہ بھی بنگالہ مسلمانوں کو متاثر کیا۔ ایک تو اس وسیع تحریک نے بنگالہ ہندوؤں میں نشاۃ ثانیہ کی کیفیت پیدا کر دی اور اب زندگی کے ہر شعبے میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر ہاتھ مارنا شروع کر دیا۔ دوسرے کرشن بھگتی کی شدید جذباتی کیفیت نے کثرت سے بااثر اشعار کا جامہ اختیار کیا۔ اس کا اثر مسلمانوں پر دو طرح ہوا۔ ایک تو اس نئے ادب نے بنگالہ زبان اور ادب کو ایک خاص رنگ دے دیا۔ جس نے بنگالی بولنے اور سمجھنے والے مسلمانوں کو متاثر کیا۔ دوسرے کرشن بھگتی کے اشعار اس طرح مقبول ہو گئے کہ کئی مسلمانوں نے جو ویشنو نہ تھے، ان مضامین پر نظمیں لکھیں۔ بالآخر حالت یہاں تک پہنچی کہ چشم

---

(۱) ایضاً ص: ۴۹۷

پیروں کی مجالس سماع میں بشن پد (وشنو گیت) گائے جاتے اوران پر اہل حال وجد کرتے۔ اس زمانے کی ایک دلچسپ تصنیف ''مسائل الشیوخ'' ہے جو حضرت نور قطب عالم کے سلسلے کے ایک بزرگ، شاہ قطب الدین حقانی نے نویں صدی ہجری کے آخر میں مرتب کی۔ اس کتاب میں حضرت نور قطب عالم سے ایک روایت منسوب کی گئی ہے کہ جب ان کی محفل میں ''بشن پد'' دوسری نعتوں وغیرہ کے ساتھ گانے گاتے اور کسی نے کرشن۔ رادھا اور اس طرح ہندو ناموں پر اعتراض کیا تو جواب دیا گیا کہ قرآن مجید میں بھی فرعون، نمرود کے نام ہیں۔ اس روایت سے شیخ اکرام نے درج ذیل نتیجہ اخذ کیا ہے۔ حضرت قطب عالم سے اس روایت کا انتساب تو غالباً بشن پد کے جواز کے لئے ایک مستند اور مشہور بزرگ کے ارشاد ڈھونڈنے کا نتیجہ ہے۔ اتنا قرین قیاس ہے کہ جن بزرگوں نے یہ روایت اپنی کتاب میں درج کی ہے۔ ان کی مجلس میں کم از کم اس زمانہ کی مجالسِ صوفیاء میں بشن پد نعتوں اور قوالیوں کے ساتھ ساتھ پڑھے جاتے تھے۔''(۱)

ہندو مسلم تعلقات کی دوسری جہات:

مؤرخین و مصنفین نے ہندوستان کی تاریخ کا بہت ہی انصاف اور اعتدال سے جائزہ لیا ہے لہٰذا رواداری کے اور باہمی اتحاد و یکجہتی اور متحدہ قومیت

(۱) ایضاً ص: ۴۹۷۔۴۹۸

کے حوالے سے مسلمانوں کی جو خدمات جلیلہ ہیں وہ تاریخ میں بالکل عیاں ہیں، چنانچہ گذشتہ باب میں ہم نے دیکھا کہ مسلمان اپنے ملک بھارت سے کس قدر عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔صرف عقیدت و محبت ہی نہیں بلکہ ہندوؤں کے دھرم، تہذیب، زبان اور ان کے بزرگوں کی تعریف و توثیق کے ساتھ ساتھ عزت و احترام بھی کرنے میں کسی طرح کی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔آج کیونکہ بڑی خوبصورتی اور سیاسی قوت کی بناء پر مذہب و دھرم کے غلط استعمال سے نفرت اور اتحاد و یکجہتی کو جس طرح تار تار کیا جا رہا ہے وہ شرمناک ہے۔جبکہ ڈاکٹر محمد عمر نے ہندوستانی سماج کی خوبصورتی اور یہاں کی ہم آہنگی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''مسلمانوں کے آنے سے قبل ہندوستان میں کئی مذاہب، مثلاً بدھ دھرم، جین دھرم اور ویدک دھرم مروج تھے۔ان مذاہب کے علمبرداروں کی تعلیمات میں سخت اختلافات پائے جاتے تھے لیکن پھر بھی چوں کہ وہ پیدائشی ہندوستانی تھے اس لیے ان میں ظاہری تصادم تک نوبت نہیں پہنچی، ہر شخص کو آزادی تھی کہ وہ جس مذہبی عقیدے کو چاہے اپنا لے۔یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں یورپ کے مقابلہ میں یہاں کے مختلف مذاہب کے درمیان فرقہ وارانہ تصادم اور اشاعت مذاہب اور عقائد میں تشدد اور جبر کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔''(۱)

(۱) محمد عمر (ڈاکٹر) ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، پبلی کیشن ڈویژن اے ایم یو علی گڑھ، ۱۹۷۵ء، ص:۱۳

جب ہندوستان میں مسلمان وارد ہوئے تو پھر یہاں ایک مسئلہ پیدا ہوا وہ یہ کہ مسلمان ہندوستان پر حکومت وسیادت کی غرض سے آئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ ایک ایسا دین لائے جو یہاں کی عوام اور معتقدین سے بالکل مغایر وجدا تھا۔ اس نظریہ پر ہندو مسلم افتراق کے اسباب البیرونی نے اپنی کتاب میں درج کیے ہیں:

> ''ہندو ہر اعتبار سے ہم سے بالکل مختلف ہیں اور ان کی بہت سی باتیں ہم کو بہت پیچیدہ اور مبہم معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر ہمارے اور ان کے درمیان زیادہ قریبی روابط قائم ہو جائیں تو ان کو سمجھنا آسان ہو جائے گا اور وہ باتیں جو سمجھ اور فہم سے بالاتر معلوم ہوتی ہیں، صاف اور واضح ہو جائیں گی۔''(۱)

ہندو اور مسلمانوں کے درمیان دوریوں کے جو اسباب بیان کیے ہیں، ان میں بنیادی طور پر افتراق دین ہے۔ ہندو دین میں ہم سے بالکل مختلف ہیں نہ تو ہم کسی ایسی چیز کا اقرار کرتے ہیں جو ان کے یہاں پائی جاتی ہے اور نہ ہمارے دین کی کسی بات کو وہ مانتے ہیں(۲) اس طرح انہوں نے لسانی اختلاف کو بھی دوری کا سبب قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر ہم ان کی زبان اور مذہب کو سیکھنے کا اہتمام کریں اپنے مدارس و مکاتب میں اس پر توجہ دیں تو یقیناً اس سے ہندو اور مسلمانوں کے مابین پائی جانے والی نہ صرف بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا بلکہ ایک دوسرے کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ تاریخ نگاروں نے بتایا کہ مسلمانوں کی آمد کی ابتداء میں تو باہم دونوں قوموں میں نفرت وحقارت

---

(۱) ایضاً، ص:۲۰

(۲) ایضاً، ص:۱۷

پائی جاتی تھی مگر یہ صورت حال بہت دیر تک قائم نہ رہ سکی، اس نکتہ کو ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی کتاب ''ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر'' میں ڈاکٹر تارا چند کی کتاب **Influence of Islam on Indian Culture** کے حوالہ سے لکھا ہے:

> ''جب فتح یابی کا پہلا طوفان تھم گیا اور ہندو اور مسلمان ایک پڑوسی کی طرح رہنے لگے تو بہت دنوں تک ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے انہوں نے ایک دوسرے کے خیالات، عادات و اطوار رسم و رواج کے سمجھنے کی کوشش کی اور بہت جلد ان دونوں قوموں میں اتحاد ہو گیا۔''(۱)

جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی تو مسلمانوں نے جس رواداری اور انصاف وعدل کا مظاہرہ کیا اس کی بہت ساری مثالیں اس وقت کے تاریخی لٹریچر میں موجود ہیں۔ چنانچہ مغلیہ دور کے حکمراں جلال الدین محمد اکبر نے اتحاد و یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کے حوالے سے جو اصول مرتب کیے تھے ان کو تقریباً تمام انصاف پسند مؤرخین و مؤلفین نے درج کیا۔ اکبر گرچہ بہت زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا مگر وہ سیاسی بصیرت اور فہم وفراست سے موجزن تھا۔ اسی وجہ سے اس نے ملک کی تمام رعایا کو یکجا کرنے کی کامیاب سعی کی۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد عمر نے آئین اکبری کے حوالے سے لکھا ہے:

۱۔ تمہیں اپنے دماغ کو مذہبی تعصب سے متاثر نہیں ہونے دینا چاہئے۔ بلا تعصب انصاف کرنا چاہئے، اور ساتھ ساتھ ہر ایک طبقہ کے لوگوں کے مذہبی رسم و رواج کا پورا پورا خیال رکھنا چاہئے۔

---

(۱) ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص:۱۶

۲۔ خاص طور پر گئوکشی سے پرہیز کرنا۔ جو تمہیں ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ ربط میں معاون ثابت ہوگی۔ اور اس طرح تم اس سرزمین کے لوگوں کو شکر گذاری کے رشتہ سے باندھ دوگے۔

۳۔ تمہیں کسی فرقے کی عبادت گاہوں کو کبھی مسمار اور برباد نہیں کرنا چاہئے اور ہمیشہ انصاف پسند ہونا چاہئے تاکہ بادشاہ اور اس رعایا کے درمیان خوشگوار تعلقات رہیں، اور جس سے ملک میں امن کا بول بالا ہو۔

۴۔ اشاعت اسلام کا کام ظلم اور سختی کے بجائے محبت اور عہد و پیمان سے بخوبی چلے گا۔

۵۔ اپنی رعایا کی مختلف خصوصیات کا اس طرح خیال رکھو جس طرح کہ ایک سال کے مختلف موسموں کا تاکہ سیاسی جسم مرض سے بری رہے۔ آگے لکھا ہے۔ ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے لوگ رہتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرو کہ بادشاہوں کے بادشاہ نے اس ملک کی حکومت تمہارے سپرد کی ہے۔[1]

ان تمام حقائق پر نظر کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں گنگا جمنی تہذیب اور رواداری ماحول کو مستحکم کرنے کے لیے اکبر بادشاہ نے تمام مذہبی پابندیوں کا سدباب کر دیا تھا، یگانگت واتحاد کے رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے ہندوستان کی تمام رعایا کو بشری حقوق سے سرفراز کیا گیا۔ اس باہمی اتحاد کے حوالہ سے ڈاکٹر سید محمود نے اپنی ایک نادر کتاب ''متحدہ ہندوستانی قومیت'' میں آچاریہ پر پھلا چندر کی کتاب **"Letters of Aurangzeb"** کے حوالہ سے لکھا

---

(۱) ایضاً ص:۲۵۔۲۶

ہے:

''جس وقت انگلستان کی ملکہ معمولی حقوق کی خاطر اپنی رعایا پر ظلم ڈھا رہی تھی، اس وقت اکبر نے عوام کے حقوق تسلیم کئے اور ایسی عادلانہ حکومت کی جس کی مثال آج بھی شائستہ حکومتیں نہیں پیش کرسکتیں۔''(۱)

ڈاکٹر سید محمود کہتے ہیں کہ ''یہ کوئی اکبر کی خصوصیت نہیں تھی بلکہ ''مذہبی رواداری'' جس میں مصلحت اندیشی سے کسی طرح فیاضی کی کمی نہ تھی، مسلمانوں کے دورِ حکومت میں پائی جاتی ہے اور یہ صرف مغل بادشاہوں کے یہاں نہیں بلکہ دیگر مسلم حکمرانوں کے یہاں بھی موجود تھی''۔ خود بے چارے بدنام عالمگیر کے بارے میں الفنسٹن **(Alphinston)** کی کتاب **History of India** کے حوالہ سے نہایت عمدہ بات لکھی ہے:

''یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ کسی ایک ہندو کو بھی محض ہندو ہونے کی وجہ سے موت یا قید کی سزا دی گئی ہو، یا اس کو جائداد کا ٹیکس دینا پڑا ہو، یا پھر کبھی اپنے آباؤ اجداد کے طریقے پر آزادانہ عبادت کرتے ہیں اس پر اعتراض کیا گیا ہو۔''(۲)

اسی طرح شیر شاہ سوری اور اس کی روادارانہ پالیسی پر نہایت مستند ذرائع سے گفتگو کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

'' ہندو اور مسلمانوں نے بارہا متحدہ طور پر ہندوستان کی حفاظت کی خاطر جو جاں سپاریاں کی ہیں، تاریخ کے صفحات ان حقائق سے مالا مال ہیں ملک کے امن و اتحاد کے لیے جو

---

(۱) سید محمود (ڈاکٹر) متحدہ ہندوستانی قومیت، ادبی مرکز ہند پبلی کیشنز، بمبئی، ص:۱۴

(۲) ایضاً، ص:۱۴

نظیریں ہمیں ملتی ہیں وہ بہت ہی اہم ہیں۔تاریخ فرشتہ میں مذکور ہے،قریب ایک لاکھ راجپوت رانا سنگا کے جھنڈے کے نیچے تھے اور سلطان ابراہیم کے بہت سے امراء جواب تک بابر کے ساتھ شریک نہ ہوئے تھے، رانا سنگا کے ساتھ دوستی کا دم بھرتے تھے،محمود خاں سکندر لودی کا بیٹا بارہ ہزار سواروں کے ساتھ اُس سے (رانا سے) جاملا اور مارواڑ کا راجہ دیو میواتی بارہ ہزار (اور بہت سے راجگان) اس کے فرمانبردار ہوئے، حسن خاں میواتی بارہ ہزار سوار کے ساتھ اس کی مدد کو آیا،اور دو لاکھ سواروں کے ساتھ ہندوستان کو بچانے کے لیے آگرہ کی طرف متوجہ ہوا۔چونکہ بابر بعض ہندوامراء پر بھروسا نہ رکھتا تھا،اس لیے ہر ایک کو ایک سرحد پر مقرر کر کے خود اس مغل لشکر کے ساتھ جو کابل سے اس کے ہمراہ آیا تھا، اور چاہندی امیر کمال خاں وجلال خاں، سلطان علاء الدین کے بیٹے اور علی خاں فرملی اور نظام خاں حاکم بیانہ کے ساتھ آگرہ سے روانہ ہوئے، جب موضع کانوہ (خانوہ) میں پہنچے جو بیانہ کا علاقہ تھا، وہاں قیام فرمایا اور بیانہ کے اطراف میں دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہوئی، رانا سنگا کے ساتھ حسن خاں میواتی اور دوسرے مسلمان سردار موجود تھے، حسن خاں میواتی اس لڑائی میں مارا گیا۔ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے ہندو مسلم سب متفق ہوگئے، یہ دلیل اس بات کی ہے، کہ پٹھانوں کی حکومت میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات برے نہ

تھے، یہی حال ہمیشہ رہا،ایک حکمراں دوسرے کومفتوح کرنا
چاہتا، ہندومسلمان کی تخصیص نہ تھی، نادر شاہ کے مقابلہ
میں مسلمان لڑے،اس طرح احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ میں
مرہٹوں کے دوش بدوش مسلمان بھی لڑے''۔(۱)

یہ ہندوستان کے وہ عظیم الشان تاریخی کارنامے ہیں جن کے نتیجہ میں ایک تہذیب کا وجود عمل میں آیا جسے ہم مشترکہ تہذیب کے نام سے یادکرتے ہیں۔تاہم اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ہندواور مسلمانوں کے باہمی معاملات ہر موقع اور ہر موڑ پر نہایت خوشگوار رہے ہیں، نیز اس بات کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسلمان ہندو راجاؤں کے ساتھ شانہ بشانہ لڑتے تھے اوراپنے وطن کی حفاظت کرنا، اپنا دینی اور ایمانی فریضہ سمجھتے تھے۔

مشترک تہذیب اوراس کی قدریں:

ڈاکٹر سید محمود نے مشترکہ تہذیب اور متحدہ ہندوستانی سماج کے متعلق بڑی عالمانہ اورمحققانہ گفتگو کی ہے، نیز مشترکہ تہذیب کی پرورش وپرداخت کیسے ہوئی اس پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے:

''جب ہندوستان میں مسلمان آئے توانہوں نے اپنی
تہذیب وثقافت کے پروان چڑھانے کے بجائے خود
ہندوستانی تہذیب کے اثر سے متاثر ہوئے۔مسلمانوں نے
شروع شروع میں تو کچھ اپنا اثر ڈالالیکن بعد میں وہ ہندو
تہذیب سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ بالکل اس رنگ میں
رنگ گئے۔اس میل جول تاثیر واثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی

(۱) ایضاً ص:۱۴۔۱۵

تہذیب ہندوستان میں آ کر اپنا اصل رنگ قائم نہ رکھ سکی اور ان دونوں کے میل سے ایک تیسری تہذیب نے جنم لیا، جسے ہم ''لوبون'' کی زبان میں ''اسلامی تمدن ہند'' یا صاف طور پر ''انڈو مسلم کلچر'' (ہندو مسلم تہذیب) کہہ سکتے ہیں۔ یہی وہ ہندو مسلم تہذیب ہے جو اکبر اور دوسرے مغل بادشاہوں کے دربار میں پرورش پاتی رہی، اور آج سے پچاس سال پہلے تک متوسط طبقوں میں شائستگی کا معیار قرار دی جاتی رہی۔''(۱)

ایک دوسری جگہ وہ متحدہ تہذیب اور مشترکہ اقدار کے فروغ کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''مسلمانوں کی دانشمندانہ اور وطن پروانہ حکمت عملی، نیز دیسی زبانوں اور تہذیب کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی، صوفیوں کا عوام سے میل جول، دونوں قوموں کے بلند حوصلہ افراد کا اشتراک، ان تمام چیزوں نے بلاارادہ ایک مشترک قوم اور ہیولیٰ تیار کر دیا اور ہم پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انگریزوں کی حکومت یہاں جمنے سے پہلے ایک مشترکہ ہندوستانی قوم تیار ہو چکی تھی۔''(۲)

اسی طرح ڈاکٹر سید محمود نے ہندوستان کی تعمیر و ترقی اور اس کے بہتر مستقبل کے لیے دونوں قوموں کو جو مشورہ دیا ہے وہ نہایت ہی اہم ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

---

(۱) ایضاً، ص: ۱۷۔۱۸

(۲) ایضاً، ص: ۱۶

''پراچین بھارت کا طور طریقہ پھر زندہ کرنا چاہتے ہیں، اگر دونوں قوموں کو یکجا رہنا ہے اور ملک کی فلاح و بہبود کی خاطر دوش بدوش کام کرنا ہے تو اس غلط خیال کا قلع قمع کرنا ضروری ہے دونوں کو یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ یہ مشترک تہذیب اور اس کی لازمی پیداوار مشترک زبان کوئی اسلامی اور بدیسی سرمایہ نہیں یہ تہذیب اور زبان اس زمین اور آب و ہوا کی پیداوار ہے اور ان کی ترقی اور پرداخت میں دونوں قوموں کا برابر کا حصہ رہا ہے۔ نیز جو جماعتیں ملک کی فلاح و بہود کا کام کرنا چاہتی ہیں ان کا اولین فرض ہے کہ وہ اس ''مشترکہ ورثہ'' کے بچے کھچے آثار کی پوری حفاظت کریں ورنہ ہوا کا رخ کچھ اور ہی بتا رہا ہے۔''(۱)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی فلاح و بہبود اور ترقی و کامرانی کی ضمانت اس بات میں منحصر ہے کہ دونوں (ہندو مسلم) قومیں باہم رائج غلط فہمیوں کو دور کریں اور متحد و متفق ہو کر رہیں، مشترکہ تہذیب کی پرورش کے حوالہ سے سید محمود کا یہ اقتباس بھی قابل ذکر ہے:

''مسلمانوں کی فرمانروائی نے بہت جلد اجنبی لبادہ چھوڑ دیا، ملک کے بیشتر مسلمان نسلاً ہندوستانی تھے اور ہیں۔ یہاں تک کہ غیر ملکی سلاطین و امراء بھی ''ذہن'' زندگی اور مفادات کے اعتبار سے ہندوستانی ہو گئے۔''(۲)

ہندوستان کی وسیع ثقافت اور مشترک قدروں کے فروغ میں بہت

(۱) ایضاً ص:۱۸

(۲) ایضاً ص:۱۳

سارے کردار ہیں، ان مشترک قدروں کے اثرات زبان سے لے کر وضع قطع، رہن سہن، موسیقی اور فن تعمیر وغیرہ میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح مشترک تہذیبی قدروں کے فروغ میں صوفیاء کرام نے بھی بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اب ذیل میں ان آثار ثقافت کو قلمبند کیا جائے گا جنہوں نے ملک کے ورثہ کو نہ صرف محفوظ کیا بلکہ ان سے ملک کی سالمیت اور یکجہتی کا جو سنگم تیار ہوا وہ تاریخ کا اہم حصہ ہے۔

مشترک سماجی قدریں:

ڈاکٹر محمد عمر اپنی کتاب ''ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر'' میں تحریر کرتے ہیں:

> ''عرصۂ دراز سے ساتھ ساتھ رہنے کا اثر یہ ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ظاہر زندگی میں کوئی عملی فرق اور امتیاز باقی نہ رہا اور ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی سماجی زندگی میں برابر کے شریک ہو گئے وہ ایک دوسرے کے تہواروں اور شادی بیاہ کی مجلسوں میں بڑی گرم جوشی اور خوش دلی سے شریک ہوتے تھے۔''(۱)

اس کے علاوہ ہندوؤں کے میلوں میں نہ صرف شریک ہوتے تھے بلکہ ان کے مذہبی میلوں کی بڑی قدر بھی کرتے تھے۔ چنانچہ منشی محمد سعید احمد نے اپنی کتاب ''امرائے ہنود'' میں ہندوؤں کے متبرک مقام تھانیسر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ '' تھانیسر ہندوؤں کا متبرک مقام ہے وہاں ہر سال اشنان کا میلہ نہایت دھوم دھام سے ہوتا ہے، سلطان سکندر لودی نے اس میلے کو بند کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میاں عبداللہ اجودھی نے جو بڑے مشہور عالم اور بزرگ تھے اس معاملہ

(۱) ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص:۵۱

میں بادشاہ کی سخت مخالفت کی اورنہایت دلیری سے فرمایا کہ بتخانے ویران کرنا کسی طرح جائزنہیں ہے،اورجس حوض یا دریا میں قدیم سے غسل ہوتا آیا ہے، اس کی ممانعت کرنا کسی طرح روانہیں ہے۔ یہ جواب سن کر بادشاہ کو بہت غصہ آیا اور خنجر ہاتھ میں لے کر دوڑا اور کہا کہ تو کفار کی حمایت کرتا ہے،انہوں نے اسی دلیری اور جرأت سے پھر جواب دیا کہ جو کچھ شریعت کا حکم ہے وہ بتاتا ہوں ماننانہ ماننا آپ کے اختیار میں ہے۔ یہ جواب سن کر بادشاہ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اوراپنی بات سے رک گیا۔''(۱)

اس طرح سماجی روایتوں کے فروغ اورخوشگوار تعلقات کے حوالے سے''ہندوستانی تہذیب کامسلمانوں پراثر'' کےمصنف لکھتے ہیں:

''لکھنؤ میں آٹھواں کا میلہ ہوتا تھااس میلہ میں مسلمان زن ومرد شرکت کرتے تھے، نیز دہلی کے مسلمان گڑھ مکتیشور کے میلے میں شرکت کے لیے جایا کرتے تھے،وہاں کے میدانوں میں گنگا کے کنارے خیمے کھڑے کرتے،عورت اورمرد کشتی رانی کا حظ اٹھاتے،اس میلے کے دنوں میں آنند رام مخلص کے ہمراہ اکثر شرف الدین پیام بھی جایا کرتے تھے۔ دہلی میں کالکاجی کا میلہ ہوتا تھا،اب بھی ہوتا ہے۔اس میں مسلمانوں کی شرکت ہوتی تھی، دہلی میں کیلاش کے میلے میں مسلمانوں کی شرکت کا ذکر بھی اکثر مصنفین نے کیا ہے۔ اسی طرح ہندو بھی مسلمانوں کے تہواروں میں شرکت کرتے تھے،اوراپنے گھروں میں ان کی رسوم بھی ادا کرتے تھے۔

(۱) ماہر بریوی،منشی محمد سعید احمد،امرائے ہنود،نامی پریس کانپور،۱۹۱۰ء،ص:۲۱

مرزا راجہ رام ناتھ ذرّہ کے بارے میں لکھا ہے کہ محرم منایا کرتے تھے، عاشورہ کے دنوں وہ سبز لباس زیب تن کیا کرتے تھے، سبیل لگواتے تھے، غریبوں اور مسکینوں کو کھانا تقسیم کرتے تھے۔''(۱)

آنندرام مخلص کے متعلق امتیاز علی عرشی نے لکھا ہے:

''اول تو پشتوں سے مسلمان امراء کی ملازمت، پھر اس پر حضرت بیدل کی صحبت ان کی درویشی کا رنگ اس پر ایسا چھایا کہ ہر تحریر میں جا بجا اس کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ حالانکہ مخلص اپنے مذہبی اصولوں کا پابند تھا۔ گنگا میں اشنان کرنے کے بعد اس نے گوشت کھانے سے احتراز کیا اور دوران سفر بھی اس پر کاربند رہے، لیکن مذہبی رواداری وسیع المشربی اور اپنے دوستوں کے لیے محبت اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔''(۲)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی وہ ادارہ ہے جس کی شرست میں انسان دوستی اور ملک سے محبت وعظمت پنہاں ہے۔ چنانچہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ ہندی کے استاد ڈاکٹر گوور دھن ناتھ شکل توسع اور رواداری میں آنندرام مخلص سے کسی طرح کم نہیں تھے۔ ان کے کتب خانے میں گیتا کے ساتھ قرآن مجید کا ہندی ترجمہ بھی موجود تھا۔ وہ اکثر قرآن مجید کا مطالعہ کرتے تھے، ہندی تصوف کے ساتھ ان کو اسلامی تصوف سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ مسلم صوفیاء کا نام بڑے احترام سے لیتے تھے۔

---

(۱) ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص:۵۲

(۲) ایضاً، ص:۵۳

یہ وہ خصائل واوصاف ہیں جنہوں نے ہندوستان میں فرقہ واریت کو کبھی نہیں پنپنے دیا، کیونکہ سماج میں جن چیزوں کا رواج تھا وہ دونوں مذاہب کے علمبرداروں میں یکساں تسلیم کی جاتی تھیں۔

مشترکہ ثقافت اور زبانیں:

یہ بات بالکل درست ہے کہ کسی بھی معاشرہ کی وسیع المشربی کے فروغ اوراس کی ترتیب وتبویب میں زبانیں بڑا بنیادی کردارادا کرتی ہیں، یہ ذمہ داری اس وقت کے ادباء، فصحاء اورشعراء پر بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ ملک کے سماجی ڈھانچے واکائیوں کومنتشر ہونے سے بچائیں۔اس طرح ایک ایسانظام تشکیل دیں جس میں تکثیریت وتعدد کے باوجود یک رنگی اورہم آہنگی کے اصول پائے جائیں۔لہٰذا ہندوستان میں،اردو، ہندی یادیگر علاقائی زبانوں کودیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان زبانوں نے ہندوستان کی مشترکہ اقدار کے فروغ میں بڑا کردارادا کیاہے۔اس فلسفہ کوکامل قریشی نے ڈاکٹر تاراچند کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''مسلم ذہن ہندوانہ رنگ روپ قبول کرنے لگا اوراس نے فارسی وترکی کی جگہ مقامی زبانوں کوسیکھا اور استعمال کرنا شروع کیا۔ ہندوؤں نے عربی، فارسی اورترکی الفاظ کومقامی محاوروں میں جگہ دی،اس لین دین کا منافع ہماری تہذیب کے خزانے میں اردوزبان کی شکل میں ہوا۔''(۱)

اسی وجہ سے اردو کے بہت سے شعراء نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کواپنے اشعار میں پیش کیاہے۔نعت کے معروف شاعرمحسن کاکوروی نے اپنے (جنہیں حسان الہند کے لقب سے یادکیاجاتاہے) قصیدوں میں انڈومسلم کلچر

(۱) کامل قریشی،اردواورمشترکہ ہندوستانی تہذیب،ص:۱۶

کے حوالہ سے بڑی دلچسپ گفتگو کی ہے:

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدان گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے ایک طول عمل
دیکھئے ہوگا سری کرشن کا کیونکر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل

اس طرح امیر مینائی نے ہندوستان کی مشترکہ سماجی قدروں کا جس طرح خیال رکھا وہ ذیل کے شعر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

سانولی دیکھ کے صورت کسی متوالی کی
ہوں مسلماں، مگر بول اٹھوں جے کالی کی

اس طرح اردو کے ایک اور معتبر شاعر ساغر نے اپنے کلام میں ہندوستان کی سماجی قدروں اور ہندو مسلم اتحاد کا جس طرح خیال رکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے:

سانولے پن پہ غضب دھج ہے بسنتی شال کی
جی میں ہے کہہ بیٹھے، جے ہو کنھیالال کی
سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو
کرشن کی بنسی کا ایک بہتا ہوا نغمہ ہے تو

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری ہو یا اردو ادب ونثر اس میں ہمیں بلاتعصب ہندوستانی روایات اور قومی یکجہتی کا عکس نظر آتا ہے۔اسی طرح عام رجحان یہ ہے کہ اردو وعربی صرف مسلمانوں کی زبانیں ہیں لیکن عربی زبان و

ادب کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر بھی بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو ہندی الاصل ہیں یا ہندوستانی تہذیب وثقافت سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ ماہرین نے لکھا ہے:

''عربی زبان میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو ہندوستان سے میل جول کا پتہ دیتے ہیں۔ عربی زبان نے جس طرح سریانی، عبرانی، حبشی، ایرانی، قبطی زبانوں کے مفردات کو اپنے اندر جذب کیا اسی طرح سنسکرت کو بھی قبول کیا ہے اور سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود قرآن کریم میں سنسکرت لفظ موجود ہے۔''(۱)

اس روایت کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر نکلسن کے حوالہ سے تحریر کیا ہے:

''بلخ و بخارا تک، بدھ مذہب کے راہب اوران کی خانقاہیں پھیلی ہوئی تھیں، منجملہ اورمقامات کے یہی وہ مراکز ہیں جہاں بدھ مت اور تصوف اسلامی کا سنگم ہوا۔ الجزری کی روایت کے مطابق وہاں ایک محلّہ ہندوؤں کے نام سے تھا جہاں ہندوستان سے آنے والے لوگ قیام کرتے تھے۔ **یقال لها باب هندوان، ینزل فیها الغلمان والجواری التی یخلب من الهند۔''** (۲)

اس طرح قاضی اطہر مبارک پوری کی معروف کتاب ''رجال السند والھند'' کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی بہت سی شخصیات تھیں، جو عربی زبان وادب سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ہندی تہذیب اور یہاں کے ورثہ سے

(۱) کامل قریشی، ڈاکٹر، اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، اردو اکادمی دہلی، ص:۶۵

(۲) ایضاً، ص:۶۵

بھی کافی مانوس تھیں۔

تعمیرات میں ہندو مسلم اثرات:

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستان کی روحانی وسماجی قدروں کے ارتقاءاور اس کے بالغ ہونے میں ہندوستان کی تعمیرات کا بڑا دخل ہے۔ملک کی قدیم تعمیرات میں ایسے بہت سے نقوش واثرات ہیں جن میں ہندوستانی تمدن وثقافت کے اثرات نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں۔ڈاکٹر عابد حسین نے اپنی گراں قدر تصنیف ''قومی تہذیب کا مسئلہ'' میں جن شواہد وحقائق کو پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں:

> ''دراصل مسلمانوں کے ذوق جمال کے اظہار کا خاص ذریعہ فن تعمیر تھی اوراس میں اس کے مواقع زیادہ تھے کہ ہندو ذہن اور مسلمان ذہن کا اثر ایک دوسرے پر پڑے، ہندوستان کے حکمرانوں میں سب سے زیادہ قوت اوردولت کے مالک اس زمانہ میں بادشاہ تھے اوروہی شاندار عمارتیں بنواسکتے تھے لیکن بنانے والے ہندو معمار اورکاری گر تھے، عمارت کا جو تصور کسی مسلمان بادشاہ کے ذہن میں آتا وہ بجائے خود ہندوستانی ماحول کے اثر سے خالی نہیں ہوتا تھا اور پھر یہ تصور حقیقت کی شکل اختیار کرتے وقت ہندو معمار کے ذہنی سانچے میں ڈھل جاتا تھا۔چنانچہ ہندو مسلم ذہن کا جو امتزاج مذہب میں، باوجود چند بزرگوں کی شعوری کوشش کے پوری طرح نہیں ہوسکا وہ فن تعمیر میں خود بخود ہوگیا۔سلاطین دہلی کی حکومت کی پہلی ہی صدی یعنی تیرھویں صدی عیسوی

میں ایک ہندو مسلم طرز تعمیر پیدا ہو گیا، جسے چودھویں صدی میں تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ جونپور، بنگال اور دکن کے خود مختار بادشاہوں اور بندیل کھنڈ اور راجپوتانہ کے ہندو راجاؤں نے بھی اختیار کر لیا۔ سب سے پہلے اسلامی عمارتیں یعنی اجمیر کی جامع مسجد اور دہلی کی مسجد قوت الاسلام کے بقیہ آثار اس بات کا ثبوت ہیں کہ ابتداء تعمیر کے اسلامی تصورات کو عملی وسائل سے مطابقت دینے کی ضرورت پیش آئی۔''

اس کے بعد ڈاکٹر عابد حسین نے لکھا ہے:

''اجمیر کی جامع مسجد کا نقشہ کوہ آبو کے جین مندر سے لیا گیا ہے۔ قطب مینار کی ساخت میں گپت عہد کے ستونوں اور عہد وسطیٰ کے شنکھار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ قطب مینار میں آرائشی کا کام تو براہ راست شمالی ہندوخصوصاً چینی طرز سے متاثر ہے۔ انسانوں اور جانوروں کی مورتیاں چھوڑ دی گئی ہیں، باقی بکھرے پھول، پھولوں کے ہار اور ٹوکریاں ہو بہو ویسی ہی ہیں۔ ان کے ساتھ خطہ کوفی کی تحریر کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ کھپایا گیا ہے۔ اسی طرح ہندو راجاؤں نے جو عمارتیں اس عہد میں بنوائیں ان میں بھی ہندو مسلم طرز کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ ریاست جودھپور کے مفصلات میں رنک پور کا مندر جو ۱۴۳۹ر میں تعمیر ہوا ایک چوکور اونچی کرسی پر بنا ہے، اسی طرح اس کے گنبدوں کی سطح بھی بالکل خالی ہے اور ستونوں کی ساخت مسجد کے ستونوں

سے ملتی ہے۔ یہ رنگ کسی قدیم ہندو یا جین عمارت میں نہیں پایا جاتا ہے۔ گوالیار کے راجہ مان سنگھ ۱۴۸۶ تا ۱۵۱۶ء کا قلعہ اور محلات بھی نئے طرز سے متاثر ہوئے اور انہوں نے آگے چل کر ہندو اور مغل عمارتوں کے لیے نمونہ کا کام کیا۔"(۱)

ڈاکٹر سید محمود نے یہ بھی لکھا ہے:

"مسلمانوں کے فن تعمیر نے ہندوؤں کے طرز، مثل اور مذاق میل جول کے بعد ہندوستان میں ایک جدید فن تعمیر پیدا کر دیا۔ محمود غزنوی اپنے حملوں کے دوران میں ہندی طرز تعمیر سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ متعدد معمار اپنے ساتھ غزنی لے گیا۔ یہاں اس نے ان معماروں سے مسجدیں اور محل بنوانے میں مدد لی، رفتہ رفتہ ایک ہندی، عربی (طرز تعمیر منظر عام پر آ گیا) جس کی اچھی مثالیں ہندوستان کی معروف عمارتوں میں ملتی ہیں۔"(۲)

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے:

"اسلامی گجرات کا پایۂ تخت احمد آباد راجپوتانہ کے کاریگروں کا بنایا ہوا ہے۔ اور وہاں کی عمارتوں میں عربی اور چینی طرز تعمیر کی آمیزش صاف نظر آتی ہے، ہندوستان کی اسلامی عمارات ہندی، عربی اور ایرانی طرزوں سے متاثر ہیں۔ کہیں عربی طرز غالب ہے، کہیں فارسی اور کہیں ہندی۔"(۳)

---

(۱) سید عابد حسین، ڈاکٹر، قومی تہذیب کا مسئلہ، انجمن ترقی اردو نئی دہلی، ۱۹۵۵ء، ص: ۱۱۷۔۱۱۹

(۲) متحدہ ہندوستان قومیت، ص: ۴۳

(۳) ایضاً، ص: ۴۴

ڈاکٹر سید محمود نے اپنی کتاب ''متحدہ ہندوستانی قومیت'' میں ہیول (Havell) کی معروف کتاب **"After the Great Mughals"** کے حوالہ سے لکھا ہے:

اکبر کے عہد میں صحیح طور پر ہندو مسلم طرز الگ نہیں کیا جا سکتا، فتح پور سیکری کی مسجد، اکبر کے ذوق کا اچھا نمونہ ہے، یہ مسجد سے زیادہ ''وشنو مندر'' معلوم ہوتی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ہندو اور جین آرٹ کا اثر اکبر اور اس کے جانشین کے زمانے کی عمارتوں میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ شیخ سلیم چشتی کی قبر کے ہندوانہ طرز تعمیر کے حوالہ سے لکھا ہے:

''اتنے بڑے پر جوش مسلمان فقیر کے مقبرہ میں ہندو اثرات دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، عمارت کی پوری ساخت ہندو جذبہ کو ظاہر کرتی ہے اور کوئی شخص ستونوں کے ہندوانہ اثرات کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے۔''(۱)

ان اقتباسات کے پڑھنے اور ان عمارتوں پر نظر ڈالنے کے بعد فوراً یہ بات ذہن میں گردش کرتی ہے کہ ہندوستان کی قومی تہذیب اور متحدہ قومیت کے اثرات ہماری قدیم عمارتوں میں بخوبی نظر آتے ہیں۔ ہندو مسلم تہذیب کے غلبہ کا اس قدر اثر تھا کہ ہندوانہ رسوم ورواج اور ان کی طرز تعمیر مسلمانوں کے مذہبی مقامات اور ہندوؤں کے مقدس مقامات میں بجا طور پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ قومی تہذیب کے یہ وہ آثار و نمونے ہیں جس کو فراموش کرنا بھارت کی سالمیت و یکجائیت کے لیے بالکل مناسب نہیں ہے۔

---

(۱) ایضاً ص: ۴۵

صوفیاءاورمشترکہ تہذیب:

یہ بات بالکل درست ہے کہ مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کے فروغ میں ہندوستانی صوفیاء کی بڑی قابل قدر خدمات ہیں، بلکہ سچائی تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ریاضت ومحنت کے ذریعہ جتنی مقبولیت مسلم سماج میں حاصل کی تھی اتنی ہی ہندولوگ بھی قدر کرتے تھے ان سے بیعت ہوتے تھے، اپنے دکھ درد میں ان سے دعائیں کراتے تھے، اس خوشگوار روایت کے حوالہ سے ڈاکٹر سید محمود نے لکھا ہے:

> ''ہندوستان میں عرب وعجم سے بہت سے صوفیاء آئے، بہت سے بزرگ خود یہیں پیدا ہوئے، زبان کی بناوٹ اور رواج میں ان کا جو حصہ ہے، اس کو ماہر لسانیات نظرانداز نہیں کرسکتے۔ ان بزرگوں کی زبانیں یا تو عربی تھیں یا فارسی، لیکن شہروں اور گاؤں میں پھر پھر کر انہوں نے ایک مشترک دیسی زبان کی داغ بیل ڈالی، اس کے اثرات آپ کو ان کے اقوال وتعلیمات میں ملیں گے۔ شاہ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی تعلیمات ہندی میں موجود ہیں، مسلمان فقراء کا دائرہ اثر ونفوذ صرف مسلمان تک محدود نہ تھا، بلکہ کثرت سے ہندو بھی ان کے حلقہ بگوش تھے۔ ان فقراء نے بہت سے ہندو گھرانوں کی زندگی بچائی، ان کو امارت کے درجہ تک پہنچایا۔ مسلمان بادشاہوں سے ان کی جاگیریں دلوائیں یہ سلسلہ افغان بادشاہوں سے لے کر مغل عہد تک ہندوستان میں جاری رہا۔''(۱)

---

(۱) ایضاً ص:۳۷

صوفیاء نے ہندوستان کی قدروں کا جس قدر لحاظ کیا ہے۔اس کی چند مثالیں سطور ذیل میں ملاحظہ کیجئے:

''شیخ برہان الدین ،ایک بزرگ مسلمان درویش نے راجپوتانہ میں اپنا وہ اثر قائم کیا تھا کہ راجپوتوں کے ایک بڑے حلقے میں ان کی پرستش ہونے لگی تھی۔موکل جی، ایک راجپوت حکمراں تھا جس نے شیخ سے ایک بیٹے کے لیے دعا کی درخواست کی، خدا نے اس کو بیٹا عطا فرمایا، اس کا نام ''شیخ جی'' رکھا۔ شیخ برہان الدین کا مقبرہ وہاں مرجع خاص وعام ہے، اور شیخاوٹی راجپوتوں کے زرد جھنڈے کے اوپر درویش کا نیلا پھریرا لہراتا ہے۔اس بزرگ سے اظہار عقیدت کے طور پر شیخاوت راجپوت جنگلی سور کا شکار بھی نہیں کرتے۔''(۱)

ایک اور دلچسپ واقعہ ڈاکٹر سید محمود نے اپنی کتاب میں ''خلاصۃ التواریخ'' کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

''عہد عالمگیری کے مشہور مؤرخ منشی سجان رائے بٹالوی اپنی تاریخ میں ایک موضع دیپالی وال کا ذکر کرتے ہیں جو کلانور کے متصل آباد ہے۔اور جہاں شاہ شمس الدین دریائی کا مزار مرجع خلائق ہے۔ ہندو مسلمان اس کے بہت معتقد تھے،لیکن ایک ہندو دیپالی نام اپنی ارادت وعقیدت میں تمام ہندو مسلمانوں پر سبقت لے گیا تھا۔ جب شاہ دریائی کا انتقال ہوگیا تو ہندو مسلمانوں کے اتفاق سے ان کا سب سے پہلا

---

(۱) ایضاً ص:۳۸

مجاور و متولی دیپالی ہی قرار پایا جو مذہباً مسلمان نہ تھا، آگے مذکور ہے۔ مسلمان اولیاء کے مزاروں پر متولی، سجادہ نشیں، اور مجاور عام طور پر مسلمان ہوتے ہیں لیکن اس مزار پر انوار پر مجاوروں کے لیے دیپالی مذکور کی اولاد تا حال قابض ہے۔ چند سال ہوئے مسلمانوں نے ہندو مجاوروں کو علیحدہ کرنے کی بہت کوشش کی یہاں تک کہ اپنے مذہبی دعوے بھی بیان کیے لیکن عالمگیری حکومت کے عمال نے ان کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔''(۱)

اس طرح شیواجی کے باپ کا نام ''شاہ جی'' ایک مسلمان فقیر کے نام پر رکھا گیا۔(۲)

یہ بات سب جانتے ہیں کہ ''داراشکوہ نے ''اپنیشد'' کا خود ترجمہ کیا تھا، سنسکرت ادب، ہندو ودوانوں (علماء) سے اور یوگیوں سے اگر ایک طرف اس کو عقیدت تھی تو دوسری طرف وہ ملا شاہ بدخشی پر بھی جان قربان کرتا تھا۔ جہانگیر خود ایک ہندو فقیر ''گوشائیں'' جدروپ کے مٹھ پر جایا کرتا تھا، اور اس فقیر نے تصوف کے مسائل کا ویدانیت سے مقابلہ کر کے ایک بلیغ تقریر کی۔''(۳)

تصوف پر ہندوستانی تہذیب کا اثر:

اس کے علاوہ صوفیاء کے ملفوظات اور تذکروں میں مذکور ہے کہ تصوف پر ہندوستانی تہذیب کا اثر دکھائی دیتا ہے اور مسلم صوفیوں ہندو یوگیوں میں با قاعدہ روحانی مقابلے بھی ہوئے ہیں۔ اس بابت ڈاکٹر محمد عمر صاحب نے کئی

(۱) ایضاً،ص:۳۹

(۲) ایضاً،ص:۳۹

(۳) ایضاً،ص:۳۷

شواہد پیش کیے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

شیخ نظام الدین اولیاء کی ایک موقع پر ایک جوگی سے ملاقات ہوئی تھی، شیخ صاحب نے اس جوگی سے سوال کیا:

> ''اصل کار تمہارے درمیان کون سا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہماری کتابوں میں یہ مرقوم ہے کہ نفس آدمی میں دو عالم ہیں۔ ایک سفلی اور دوسرا علوی۔ عالم علوی سر سے ناف تک اور عالم سفلی ناف سے قدم تک ہے۔ عالم علوی میں جملہ صدق وصفا ونیک اخلاق وحسن معاملہ ہونا چاہئے، اور عالم سفلی میں کل نگہداشت پاکی و پارسائی کا ذکر ہے۔ اس لیے شیخ صاحب نے فرمایا۔ مجھے اس کی بات بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔''(۱)

ہندوستانی صوفیوں کی سب سے بڑی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ انہوں نے طریقت کے حقائق کی تشریح وضاحت کے لیے ہندو مذہب، ان دیومالوں اور متصوفانہ اقوال سے اخلاقی تعلیمات اخذ کی ہیں کیونکہ ہندوستانی مسلمان اسلامی روایات کے مقابلہ میں ہندوستانی روایات سے زیادہ مانوس تھے اس طرح ان کو بڑی آسانی سے رموز روحانی سمجھائے جا سکتے تھے۔(۲)

شیخ سرف الدین منیری کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے فردوسیہ سلسلہ جاری کیا، انہوں نے روحانی زندگی کے ارتقاء کے لیے مگدھ میں ایک جھرنے کے کنارے وہ مقام تلاش کیا، جس کو ہندو اور بدھ متبرک سمجھتے تھے اور اب وہ جگہ

---

(۱) ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص: ۳۵۰

(۲) ایضاً، ص: ۳۵۱

مخدوم کنڈ کہلاتی ہے۔(۱)

تصوف میں ہندوستانی تہذیب کے اثرات کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے:

البیرونی کے علاوہ ایک دوسرے مسلمان رکن الدین سمرقندی نے ہندو تصوف کی کتاب ''امرت کنڈ'' کا پہلے عربی اور بعد میں فارسی میں ترجمہ کیا تھا، اس کام میں انہوں نے بھوجن نامی ایک برہمن سے مدد لی تھی اور اس سے سنسکرت بھی پڑھی تھی۔(۲)

ان شواہد سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی تصوف میں مشترکہ تہذیب اور ہندوستانی قومی یکجہتی کی روایات کے عناصر بکثرت ملتے ہیں۔انہیں اسباب و وجوہ کی بناء پر ہندوستان میں قومی روایتوں اور سماجی تعلیمات میں یک رنگی اور مماثلت و یکسانیت پائی جاتی ہے۔

یہ چند اشارات تھے،اس میں ہندو مسلم تمدن کے متعلق جو ایک طویل عرصے میں دونوں قوموں کے میل سے پیدا ہوئے،افسوس کہ اب اس کے یہ تابندہ اور روشن نشانات دھندلے ہو رہے ہیں۔لہٰذا ان کو فوری طور پر بچانے کی ضرورت ہے۔اگر یہی حالات رہے تو بہت ممکن ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد نے جو کاوشیں اور محنتیں کی تھیں وہ زائل ہو جائیں گی اور ہندوستان کی خوبصورتی پر دھبہ آجائے گا۔

☆☆☆

---

(۱) ایضاً،ص:۳۵۲

(۲) ایضاً،ص:۳۵۱

باب سوم:

سیکولرزم، حب الوطنی (نیشنلزم)

مسلمان اور ہندوستان

یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ جب کسی سماج میں تنوع، تکثیریت اورتعدد پایا جاتا ہواوراس معاشرے کےافراد پرامن طریقے سے رہیں تو یہ خوشگوار رویہ ایسے معاشرے کی بقاء وسلامتی کے لیے بہتر اقدام ہے، نیز نوع انسانی کے لیے بھی نفع رساں ہے۔ چنانچہ اس وقت ہمارے سامنے جو بنیادی اوراہم پہلو ہے وہ یہ کہ آج بڑی شدومد کے ساتھ کچھ عناصر یہ پروپیگنڈہ کررہے ہیں کہ ہندوستان کے سیکولرزم وجمہوری رویوں پرمسلمانوں کا ایمان ویقین نہیں ہے،اسی طرح اب تو مسلمانوں کی حب الوطنی پرشک کرنا بھی بعض سیاسی اورنام نہاد سماجی عناصر کا محبوب مشغلہ بن چکاہے،ان دونوں دعووں کی کیا صداقت ہے؟اس سے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا بخوبی واقف ہے۔انہی چیزوں کو مدنظر رکھ کرسطور ذیل مرتب کی جائیں گی ،وطنیت ،قومیت ،حب الوطنی جیسے مسائل پرقلم اٹھانا اورمعترضین کوان کا جواب دینااخلاقی فریضہ ہونے کے ساتھ ساتھ دینی فریضہ بھی ہے،مسلمان وہ قوم ہے جووفاداراوراپنی سرزمین ووطن کے لیے ہرحال میں مخلص رہی ہےاور ہے۔

سیکولرزم کامفہوم:

ماہرین لسانیات نے اس کے معنی اورمفہوم متعدد بتائے ہیں۔چنانچہ ڈاکٹر یوسف قرضاوی نےلکھاہے:

> ’’سیکولرزم ایک ایسی تحریک کا نام ہےجس کااصل ہدف لوگوں کی توجہ اموراٰخرت کےاہتمام سے ہٹا کرصرف دنیا کوان کی توجہ کا مرکز بنانا تھا۔کیونکہ قرون وسطیٰ میں لوگ دنیا سے کنارہ کشی کا شدید رجحان رکھتے تھےاوردنیا سے بے رغبت ہوکر

خدااور آخرت کی فکر میں منہمک رہتے تھے۔اس رجحان کے بالمقابل انسانی جذبہ اوررجحان کے بروئے کارلانے کے لیے سیکولرزم وجود میں آیا اورنشاۃ ثانیہ میں لوگوں نے انسانی اورثقافتی سرگرمیوں اوردنیا کے مرغوبات کے حصول میں زیادہ دلچسپی کااظہارشروع کردیا۔سیکولرزم کی جانب یہ پیش قدمی تاریخ جدید کے تمام عرصے میں دین (مسیحیت) سے متضاد تحریک کی حیثیت میں آگے بڑھی اورارتقاءحاصل کرتی رہتی ہے۔''(۱)

ڈاکٹرقرضاوی نیوتھرڈ ورلڈڈکشنری کے حوالہ سے سیکولرزم کا یہ مفہوم بھی بتاتے ہیں:

''زندگی یازندگی کے خاص معاملہ میں دخل نہیں ہونا چاہئے۔ یادینی اختیارات کونظام حکومت سے قصداً دوررکھنا چاہئے۔ جس سے مراد مثلاً حکومت میں خالص لادینی سیاست ہے اوردراصل یہ اخلاق کاایک اجتماعی نظام ہے۔جس کی اساس اس نقطۂ نظر پر ہے کہ معاصر زندگی اوراجتماعی وحدت ایسے عمل اورایسی اخلاقی اقدار پرقائم ہوجس میں دین کا کوئی دخل نہ ہو۔''(۲)

مذکورہ دونوں تعریفات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیکولرزم ایک ایسا نظام چاہتا ہے جس میں دین ومذہب کوالگ رکھ کرنظام حکومت وسیادت کی

(۱) قرضاوی، یوسف، اسلام اورسیکولرزم، مترجم ساجدالرحمٰن صدیقی، عالمی ادارہ فکراسلامی، اسلام آباد، طبع اول، ۱۹۹۷ء، ص:۵۰

(۲) ایضاً، ص:۵۱

جائے۔گویا مذہبی اور دینی امور کا اس میں کوئی دخل نہ ہو۔اس کے علاوہ علامہ اقبال نے اپنے ایک خطبہ (جوانہوں نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں دیا تھا) میں لفظ ''سیکولر'' کو دین کی ضد یعنی ''لادینی سیاست'' کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مولانا وحیدالدین خاں نے سیکولرزم کا جو نظریہ پیش کیا ہے اس کو بھی یہاں درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

> ''سیکولرزم کے بارے میں منصفانہ رائے قائم کرنے کے لیے دو چیزوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔وہ یہ کہ ایک ہے سیکولر فلاسفی، اور دوسری چیز ہے سیکولر پالیسی۔دونوں کے درمیان واضح فرق ہے۔جو لوگ اس فرق کو نہ سمجھیں، وہ سیکولرزم کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔سیکولر فلاسفی ابتداء میں ان لوگوں کے ذہن کی پیداوار تھی جو ملحدانہ سوچ کا شکار تھے۔مگر بعد کو فلسفے سے الگ ہو کر سیکولرزم، جمہوری نظام کی عملی پالیسی بن گیا۔عملی پالیسی کی حیثیت سے اس کا مطلب یہ تھا کہ مذہبی امور کو لوگوں کی انفرادی آزادی کا معاملہ قرار دے دینا،اور مشترک مادی مفادات کو اسٹیٹ کے دائرے کی چیز سمجھنا۔قدیم زمانہ مذہبی جبر کا زمانہ تھا۔ موجودہ زمانے میں مذہبی آزادی کو لوگوں کا ایک ناقابل تنسیخ حق قرار دے دیا گیا ہے۔سیکولر پالیسی دراصل لوگوں کی اسی مذہبی آزادی کا ایک حصہ ہے۔پہلے زمانے میں یہ طریقہ تھا کہ ایک مذہبی گروہ دوسرے مذہبی گروہ کو آزادی دینے کے

لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ وہ ان کو مذہبی تعذیب (religious persecution) کا شکار بناتا تھا۔ جدید جمہوریت میں اس کے برعکس، سیکولر پالیسی کو اختیار کیا گیا، یعنی مشترک مادی امور کو ریاست کے دائرے میں رکھنا اور مذہب اور کلچر کے معاملے میں لوگوں کو کامل آزادی عطا کرنا۔ ہر معاشرے کے لئے ضرورت ہوتی ہے کہ وہاں امن کا ماحول ہو۔ امن کے بغیر کسی بھی قسم کی کوئی ترقی نہیں ہوسکتی۔ سیکولرزم ایک عملی پالیسی کی حیثیت سے قیام امن کی یہی تدبیر ہے۔ اسی تدبیر نے موجودہ زمانے میں ترقی یافتہ ملکوں کو قدیم طرز کی مذہبی لڑائیوں سے بچایا ہے۔ چنانچہ انڈیا سے لے کر امریکا اور برطانیہ تک سیکولر اسٹیٹ کے اصول کو اختیار کیا گیا۔ اس کا مطلب مذہبی مخالفت نہیں، بلکہ مذہبی عدم مداخلت ہے۔ چنانچہ ان ملکوں میں ہر مذہبی گروہ کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ ان ملکوں میں جو چیز ممنوع ہے، وہ صرف تشدد ہے، نہ کہ اپنے مذہب پر عمل۔ سیکولرزم کے معاملے میں جو لوگ منفی ذہن رکھتے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ دو چیزوں میں فرق نہیں کرتے۔ وہ سیکولر فلاسفی اور سیکولر پالیسی، دونوں کو ایک کر کے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ اس معاملے میں درست رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھا جائے۔ سیکولرزم کے بارے میں منفی

ذہن رکھنے والے لوگ ایک غلط فہمی کا شکار ہیں۔وہ سیکولر پالیسی کوصرف مشترک مادی امور تک محدودنہیں رکھتے، بلکہ وہ اس کو مذہبی مخالفت کے ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔حالانکہ موجودہ زمانے میں سیکولرحکومت کا مطلب مخالف مذہب حکومت نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ حکومت مذہبی امور میں عدم مداخلت (interference Non) کی پالیسی کی پابند ہے۔اس معاملے میں ساری غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ ان لوگوں نے عدم مداخلت کو مخالفت کے ہم معنی سمجھ لیا۔اس معاملے کا ایک پہلو اور ہے۔وہ یہ کہ مذہبی آزادی کے اصول پر بیک وقت دوقسم کی آزادی شامل ہے مذہبی عمل اور مذہبی تبلیغ ۔موجودہ زمانے کے تمام سیکولرملکوں میں یہ دونوں قسم کی آزادی لوگوں کومکمل طور پرملی ہوئی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مذہبی گروہ انفرادی طور پر اپنے مذہب پرعمل کرتے ہوئے دوسرے مذہبی گروہوں کے درمیان اپنے مذہب کی پرامن تبلیغ پوری طرح جاری رکھ سکتا ہے۔یہ آزادی اس حد تک حقیقی ہے کہ ان ملکوں میں بہت سے لوگ اپنا مذہب بدل لیتے ہیں اوران پر حکومت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی ہے۔مثلاً امریکا میں ہرسال تقریباً ایک لاکھ امریکی، اسلامی مذہب کو اختیار کرتے ہیں۔اس اعتبار سے دیکھئے تو سیکولر

پالیسی کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مذہبی گروہ بروقت انفرادی دائرے میں اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوئے یہ کوشش کرسکتا ہے کہ وہ دوسروں کے فکراور عقیدے کو بدل سکے''۔(۱)

درج بالا اقتباس کے تناظر میں یہ بات عرض کی جاسکتی ہے کہ سیکولرزم کے اندر وسعت ہے اور سیکولر نظام ہی آج بہت ساری ریاستوں میں عوام کے دینی ،سیاسی ،اقتصادی اورلسانی حقوق کوتحفظ فراہم کرتا ہے،بشمول تبلیغ مذہب کے۔لہٰذا جدید تناظر میں سیکولرزم کے اس نظریہ کواختیار کرنے کی ضرورت ہے، جورواداری اوراعتدال وتوازن کے لیے معاون ثابت ہوسکے۔

معروف اسکالر مشیرالحق سیکولرزم کے تمام مفاہیم وتراجم کا جائزہ لینے کے بعد اپنی کتاب ''مسلمان اور سیکولر ہندوستان'' میں تحریر کرتے ہیں:

''اردو بولنے والے عام طور سے سیکولرزم کولادینیت اور سیکولر ریاست کومخالف مذہب ریاست کے مترادف سمجھتے ہیں۔ چونکہ یہ الفاظ یورپ کی ریاستوں اورعیسائی کلیسا کے درمیان صدیوں کی باہمی کشمکش کی یاددلاتے ہیں۔اس لیےان کو سنتے ہی ہم یہ سوچنے لگتے ہیں کہ سیکولرزم سچ مچ ایک مخالف مذہب تصورحیات کو کہتے ہیں۔سیکولرزم کواپنانے والی ریاست میں مذہب اور خدا کا مقام نہیں ہوتا،دشواری یہ ہے کہ یہ الفاظ چونکہ ایک اجنبی زبان اورغیرملکی سماج کی پیداوار ہیں، اس لیے ان کوسمجھنے کے لیے جب ان لغات کا سہارا لیتے ہیں جوایسی اجنبی ماحول کے تاریخی پس منظر کواجاگر کرتی ہیں

(۱) مولانا وحیدالدین خان۔الرسالہ،مارچ ۲۰۱۷ء

> تو وہاں بھی ہمیں نظر آتا ہے کہ ''سیکولرزم'' اس تصورحیات کو کہا جاتا ہے جس میں خدایامذہبی معتقدات کونظرانداز کرکے انسانی جدوجہد کا پورا زور دنیاوی زندگی کی فلاح وبہود پر ہوتا ہے۔''(۱)

متذکرہ بالاسطور سے اندازہ ہوگیا کہ سیکولرزم کے اندر جومنفی رویہ پایا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک اجنبی زبان کا لفظ ہے، البتہ ہندوستانی تناظر میں اس کے بہت سارے مثبت پہلو ہیں۔

سیکولرزم کا مثبت پہلو اور ہندوستان:

علاوہ ازیں کئی اسکالرس نے لکھا ہے کہ ''سیکولرزم'' مثبت پہلو بھی رکھتا ہے، چنانچہ حافظ محمد عبدالقیوم اپنے ایک مقالہ ''سیکولرزم ومابعد سیکولرزم'' (سیکولرزم کے بدلتے تصورات کا تعلیمات نبوی کی روشنی میں جائزہ) میں تحریر کرتے ہیں:

> ''سیکولرزم کی تعریف یہ ہے کہ تمام مذاہب آزاد ہوں گے اور ریاست کے ہر شخص کو یکساں حقوق حاصل ہوں گے۔ ہندوستان کے موجودہ حالات کے اعتبار سے یہاں کے لیے سب سے زیادہ بہتر اور قابل عمل نظام صرف سیکولر نظام ہے۔ مزید یہ کہ اسلام اور سیکولر نظام میں کوئی تبدیلی نہیں ہے''۔(۲)

یہی مقالہ نگار آگے لکھتا ہے:

> ''سیکولر اور سیکولرزم کے معنی جو انگریزی لغات میں بیان کیے گئے ہیں ان کی مدد سے صرف یورپی سیکولرزم کے مفہوم کو سمجھا جاسکتا ہے اور ان کی روشنی میں صالح اور مثبت سیکولرزم کی وہ

---

(۱) مشیرالحق، مسلمان اور سیکولر ہندوستان، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگرنئی دہلی، ۲۰۱۳ء، ص: ۱۷

(۲) محمد عبدالقیوم (حافظ) سیکولرزم، اور مابعد سیکولرزم، مجلّہ الاضواء، ص: ۳۰۱

سمتیں اجاگر نہیں ہوتیں جو دنیا کے بعض دیگر علاقوں میں ابھری ہیں۔ خصوصاً ہندوستان میں آزادی کے بعد نافذ ہونے والے آئین کی بناء پر سیکولرزم کے جس تصور کو فروغ حاصل ہوا ہے اور جو مذہب کی نفی کی بجائے تمام مذاہب کا یکساں طور پر احترام کرنا سکھاتا ہے وہ انگریزی لغات میں بیان کردہ معنی سے میل نہیں کھاتا۔''(۱)

سید حامد علی ہندوستانی سیکولرزم کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''سیکولر اسٹیٹ وہ ہے جہاں مذہب کو اجتماعی امور سے بے دخل کر کے پرائیویٹ معاملات تک محدود کر دیا گیا ہو، اور اس مختصر سے میدان میں بھی عمل کی آزادی ان حدود کے اندر رہ کر ہو جو ریاست کے قانونی ڈھانچہ نے متعین کر دی ہوں۔ ریاست کے اس تصور سے اس مذہب کی تو مصالحت ہو سکتی ہے، جس کے بانی نے ابتداء ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو اور جیسا کہ ڈاکٹر لوتھر نے کہا: سیکولرزم کی اولین بنیاد یہی ہے۔ مگر اسلام جیسا دین جو پوری زندگی کو، پرائیویٹ ہو، یا پبلک، افراد سے متعلق ہو، اجتماع اور ریاست سے، اللہ کی مرضی کے تابع کرنا چاہتا ہو، جس میں حقیقی قانون ساز صرف خدا ہے، اور جس میں ریاست کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والی ہے۔ ریاست کے اس تصور سے کس طرح

(۱) ماہنامہ، برہان دہلی، جون و جولائی واگست ۱۹۶۲ء، ص: ۳۳۔ بحوالہ ایضاً، ص: ۳۰۲

مصالحت کرسکتا ہے، یہ دونوں تو ایک دوسرے کی ضد ہیں، جہاں اسلامی نظام غالب ہوگا وہاں سیکولرزم نہ ہوگا اور جہاں سیکولرزم ہوگا، وہاں اجتماعی امور میں اسلام نہ ہوگا اور انفرادی زندگی کے محدود دائرے میں بھی اس کی حیثیت مغلوب و مقہور کی ہوگی۔"(۱)

سیکولرزم کی وضاحت کے بعد سید حامد علی ہندوستان میں سیکولرزم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ اوپر سیکولرزم کی تشریح میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ مغربی سیکولرزم کی تشریح ہے۔ ہندوستان کا اپنا سیکولرزم کا تصور ہے جو مغربی سیکولرزم سے مختلف ہے، اور اسے دین و مذہب کے خلاف سمجھنا صحیح نہیں ہے۔"(۲)

اس کے علاوہ ہندوستان کے معروف مفکر و دانشور ڈاکٹر سید عابد حسین نے ہندوستانی سیکولرزم کی جو تعریف کی ہے، اس کو یہاں بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے:

"سیکولر انداز نظر یا سیکولرزم کے بارے میں عام طور پر ہمارے ملک کے لوگوں کو اور خصوصاً مسلمانوں کو بڑی غلط فہمی ہے۔ وہ اس سے ایسا انداز فکر مراد لیتے ہیں جو سرے سے مذہب کا اور اس کی اعلیٰ قدر و قیمت کا منکر ہو، مگر دراصل سیکولرزم لازمی طور پر مذہب کا مخالف یا اس سے بے گانہ نہیں

---

(۱) بستوی، اختر (ڈاکٹر) سیکولرزم اور اردو شاعری، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۹۶ء، ص:۲۵

(۲) حامد علی، سید، مقدمہ کتاب، سیکولرزم جمہوریت اور اسلام، مصنف انعام اللہ خاں، ادارہ شہادت حق دہلی، ۱۹۷۰ء، ص:۱۰۔۱۱

ہے ۔ بہت سے لوگ جو علمی اور سیاسی سیکولرزم کے قائل
ہیں ۔ مذہب کو زندگی کی سب سے اعلیٰ قدر سمجھتے ہیں اور اس
کے سامنے سر نیاز خم کرتے ہیں ۔''(۱)

اس مفہوم کو مزید وضاحت کے ساتھ مشیر الحق نے اپنی کتاب ''مسلمان اور سیکولر ہندوستان'' میں ایک انگریزی مضمون ''سیکولرزم ، مذہب اور تعلیم'' کے حوالے سے اس طرح لکھا ہے:

''سیکولرزم اس ذہنی رجحان کو کہتے ہیں، جو کسی بھی مذہبی فلسفے یا عقیدے سے اس وقت تک مزاحم نہیں ہوتا جب تک انسان کو یہ آزادی رہتی ہے کہ وہ دنیاوی زندگی کی دیکھ ریکھ اپنی عقل اور اپنے تجربے کی روشنی میں کر سکے۔''(۲)

انہوں نے اس کے بعد تجزیہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''ایسا نہیں ہے کہ ہندوستان کا ہر شخص سیکولرزم کا صرف اثباتی مفہوم ہی لیتا ہے بلکہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سیکولرزم اور مذہب ایک خانے میں جمع نہیں ہو سکتے ،لیکن واقعہ یہ ہے کہ عمومی رجحان یہی ہے کہ سیکولرزم کسی شخص کو اس بات سے نہیں روکتا کہ وہ اپنے پسندیدہ مذاہب پر نہ صرف یہ کہ عمل پیرا رہے، بلکہ اگر چاہے تو اس کی تبلیغ واشاعت میں بھی حصہ لیتا رہے عملاً یہ بات کس حد تک قابل عمل ہے سر دست اس سے بحث نہیں، ہمیں تو صرف یہ بات دھیان میں رکھنی چاہئے کہ سیکولرزم کے اثباتی

(۱) سید عابد حسین ، ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئ دہلی، ۲۰۱۲ء، ص:۲۶۶۔۲۶۷
(۲) مشیر الحق، مسلمان اور سیکولر ہندوستان ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئ دہلی، ۱۹۷۳ء، ص: ۲۰

مفہوم ہی نے ہندوستانیوں کو مذہبی رہتے ہوئے بھی ذہنی طور سے سیکولرزم اور سیکولر ریاست کے تسلیم کرنے پر راضی کردیا ہے۔''(۱)

ان شواہد وحقائق کا اندازہ اس وقت بخوبی ہوتا ہے جب ہم ملک کے آئین ودستور کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ملک کے آئین کی رو سے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ ملک سیکولراقدار وروایات کا سچا علمبردار ہے، چنانچہ مشیرالحق نے لکھا ہے:

''جب ہم ہندوستان کو ایک سیکولر ریاست کہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ملک کے دستور پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں، جس کی رو سے ملک کا ہر شہری اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اپنے مذہبی معتقدات کی تبلیغ کرنے میں پوری طرح آزاد ہے پھر سیکولرزم یا سیکولر ریاست کا مغربی مفہوم کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان کے ہر شہری کو اپنے لیے مذاہب کا انتخاب کرنے اوراوراس پر عمل کرنے کی آزادی ہے بلکہ خود ملک کے دستور میں بھی خدا کو ایک نمایاں مقام عطا کیا گیا ہے۔ مثلاً اونچے سرکاری منصبوں جیسے صدارت، وزارت وغیرہ وغیرہ پر فائز ہونے کے بعد متعلقہ شخص کو خدا کے نام پر حلف اٹھانا پڑتا ہے یہ صحیح ہے کہ دستور نے اس کی بھی اجازت دے رکھی ہے کہ اگر کوئی شخص خدا کے نام پر حلف نہ اٹھاتا ہے تو اپنی طرف سے یہ یقین

(۱) ایضاً،ص:۲۰

دہانی کرادے کہ وہ دستور کا وفادار رہے گا۔ایسا کرنا اس لیے ضروری تھا کہ اگر کسی شخص کو خدا پر یقین ہی نہ ہوتو اس سے حلف اٹھوانا بے معنی سی بات ہوگی۔اس لیے ایسے لوگوں کے لیے حلف کے بجائے یقین دہانی کا متبادل طریقہ تجویز کیا گیا ،لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ دستور میں حلف اٹھانے اور یقین دہانی کرانے کے جو متبادل طریقے تجویز کیے گئے ہیں ان میں حلف کو اولیت کا درجہ دیا گیا ہے۔''(۱)

اس طرح ہندوستانی سیکولرزم کے خواص اور اس کے معتدل رویہ پر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے جو بات کہی ہے، وہ عہد حاضر کے تناؤ کو رفع کرنے کے لیے بہت مفید ہے:

''سیکولرزم'' نہ تو لا مذہبیت ہے اور نہ ہی دہریہ پن، سیکولرزم تو روحانی اقدار کی اس عالمگیریت پر زور دیتا ہے جسے مختلف لوگ مختلف ذرائع سے حاصل کرتے ہیں۔''

نیز سیکولرزم کے مغربی مفہوم پر تنقید کرتے ہوئے ،گجیندر کے حوالہ سے مشیر الحق نے لکھا ہے:

''اس بات کو اچھی طرح واضح کر دینا چاہئے کہ ہندوستانی سیکولرزم مذہب کے اثرات اور اس کی افادیت کو تسلیم کرتا ہے۔ ہمارے دستور کی روشنی میں سیکولرزم کا مفہوم بس اتنا ہے کہ ملک میں جتنے بھی مذاہب ہیں وہ سب کے سب

(۱) ایضاً،ص:۱۷۔۱۸

ریاست کی نظروں میں برابری کا درجہ رکھتے ہیں۔‘‘(۱)

ڈاکٹر عابد حسین نے اپنی کتاب ’’ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں‘‘ آزادی کے بعد، ملک میں جو ہم آہنگ اور سیکولر نظام ترتیب دیا گیا ہے اس کی افادیت وخصوصیت پر بڑی عمدہ گفتگو کی ہے جو ہر اعتبار سے قابل تقلید ہے:

’’ہندوستان نے جس سیکولرزم کو اپنایا ہے اور اپنے قومی آئین میں مجسم کرلیا وہ مذہب دشمن قسم کا نہیں جس نے انقلاب کے زمانے میں فرانس میں فروغ پایا تھا بلکہ وہ سیکولرزم ہے جو مغربی یورپ کے دوسرے ملکوں خصوصاً برطانیہ میں سائنس اور مذہب کے تعاون سے وجود میں آیا تھا اور جس کے اندر عقل انسانی کی صدیوں کی سیاسی اور تہذیبی فکر کا نچوڑ اور مذہب عیسوی اور دوسرے مذاہب کی اخلاقی روح سمائی ہوئی ہے۔ یہ وہی سیکولرزم ہے جسے گاندھی جی، ونوبا بھاوے جیسے دھرماتماؤں نے اور ابوالکلام آزاد اور رادھا کرشنن جیسے مذہبی مفکروں نے عالم گیر مذہب انسانیت سے ہم آہنگ سمجھ کر قبول کرلیا ہے۔

ہندوستان کے سیکولر آئین نے مسلمانوں کو اور سب مذاہب کے پیروؤں کی طرح عقیدہ وعمل اور تعلیم وتلقین کی پوری آزادی دی ہے۔اس آئین نے متعدد اسلامی اقدار کو جن میں روح انسانی اور ضمیر انسانی کی آزادی، سب انسانوں کا بلاتمیز نسل ورنگ وطبقہ، اخوت کے رشتے میں مربوط ہونا،

---

(۱) ایضاً، ص:۱۹

قانون اورسماجی انصاف شامل ہیں۔ بنیادی حقوق کے نام سے تسلیم کیا ہے اورانہیں ہندوستانی ریاست کا نصب العین قراردیا ہے۔اس کے علاوہ چونکہ یہ جمہوری ریاست کا آئین ہے اس لیے وہ مسلمانوں کو ہندوستانی شہریوں کی حیثیت سے یہ حق اورموقع دیتا ہے کہ قومی آئین یا قومی زندگی میں انہیں جو چیز اسلامی اقدار کے منافی نظرآئے ، اس کی مخالفت کرکے اسے ختم کرنے کی کوشش اوراسلامی قدروں کو تسلیم کرانے اوررواج دینے کی حمایت اوروکالت کریں، مگران کی یہ سعی اس صورت میں مؤثر ہوسکتی ہے۔ جب وہ ہندوستانی قوم سے مذہبی زبان میں نہیں بلکہ سیکولر زبان میں خطاب کریں اورجن اصلاحوں کوضروری سمجھتے ہیں ان کے حق میں نقل وروایت سے نہیں بلکہ مشاہدے، تجربے اورعقل سے استدلال کریں۔مسلمانوں کا پکا عقیدہ ہے کہ اسلامی تعلیمات عین فطرت انسانی کے مطابق ہیں اورعقل، مشاہدے، تجربے اور معیار پر پوری اترتی ہیں۔ اس لیے انہیں مطلوبہ اصلاحوں کی ضرورت کوسیکولرزبان میں سمجھانے اورسیکولردلیلوں سے ثابت کرنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے۔"(۱)

مذکورہ نکات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں سیکولرزم کا ایک جامع تصور ہے جس کے اندرتمام طبقات کے حقوق کی رعایت رکھی گئی ہے۔

(۱) ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں،ص:۲۷۱-۲۷۲

اس طرح ہندوستان کے سیکولر نظام میں اخوت ورواداری اور باہمی اعتماد وارتباط کا عنصر پایا جاتا ہے۔لہٰذا ہندوستان کی سیکولر، روادارنہ اورمعتدل روایات و رویوں کا تحفظ ہرایک کی بنیادی ذمہ داری ہے۔سیکولرزم کے اسلوب وآداب سے ہندوستانی سماج ومعاشرہ کے اندر بے گانگی اور ہمہ ہمی جیسی کیفیت سے نجات ملتی ہے۔

مسلمان اور ہندوستانی سیکولرزم:

اب سوال یہ پیدا ہوتا کہ ہندوستان کے اس سیکولر نظام کو مسلمان قبول کرتے ہیں یا نہیں؟اسی طرح ہندوستان کا سیکولر ڈھانچہ کیسے مرتب ہوا۔اس بابت معروف مفکر مشیرالحق نے اپنی کتاب ''مسلمان اور سیکولر ہندوستان میں'' تحریر کیا ہے:

> ''آزادی کے بعد ہندوستانیوں نے متفقہ طور سے یہ طے کیا کہ آئندہ سے ان کی سیاست مذہب کے تابع نہیں رہے گی۔''(۱)

ہندوستان میں تمام طبقات کے حقوق کا ذکر یہاں کے آئین ودستور میں ملتا ہے۔جناب مشیرالحق نے ہندوستانی عوام کے متعلق لکھا ہے:

> ''سیکولر ریاست کا سوال آتا ہے تو کم وبیش ہر مسلمان سیکولر ریاست کے حق میں ہاتھ اٹھاتا ہے۔''(۲)

اگر ہم موجودہ حالات کا تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ آج مسلمانوں کا طبقہ ہندوستان کو سیکولر تسلیم کرتا ہے۔البتہ کچھ لوگ ہیں جو اسلام اور سیکولرزم کا تقابل کر کے نظریہ سیکولرزم پر تنقید کرتے ہیں۔سیکولرزم کے جو مفہوم ومعنی اور تعبیر

---

(۱) مسلمان اور سیکولر ہندوستان،ص:۱۲

(۲) ایضاً،ص:۱۵

وتشریح ہمارے علماء دانشوروں اور مفکرین ومدبرین نے کی ہے اور ہندوستانی تناظر میں سیکولرزم کا جوتصور ہے اس کے مسلمان پورے طور پر حامی ہیں۔ چنانچہ مشیرالحق نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے:

جماعت اسلامی ہند نے اپنے ایک ریزولیوشن میں اس بات کی کھل کر وضاحت کردی ہے:

> ''سیکولرزم اگر یہ ہے کہ ریاست اپنے شہریوں کے درمیان ان کے مذہبی عقائد کے اختلاف کی بناء پر کوئی امتیاز نہیں برتے گی تو پھر اس پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جماعت اسلامی نے بارہا اس بات کی وضاحت کی ہے کہ موجودہ صورت حال میں وہ یہی چاہتی ہے کہ ہندوستان میں سیکولر طریق حکومت جاری رہے۔ لیکن اس افادی مصلحت سے آگے بڑھ کر اگر کسی کے ذہن میں سیکولرزم کا کوئی گہرا فلسفیانہ مفہوم موجود ہے تو پھر ہم کو اس سے اختلاف ہے۔''(۱)

اس اقتباس کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مسلمان سیکولر نظریہ کا مخالف نہیں بلکہ اس فکر اور سوچ کا مخالف ہے جو سیکولرزم کے نام پر اسلامی تشخص یا دینی شعار کو مٹادینا چاہتی ہے، سیکولرزم میں اگر انسانیت ہے، رواداری ہے، اخوت ومحبت اور اتحاد ویکجہتی کا جذبہ ہے تو ایسا سیکولر نظام نہ صرف قابل قبول ہے بلکہ محمود ہے۔ خصوصاً ہندوستان جیسے متنوع معاشرہ میں اس کی اہمیت سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ ہندوستانی

(۱) ایضاً ص:۲۵

علماء پر یا مسلمانوں پر الزام گڑھتے ہیں کہ وہ ہندوستان کے سیکولر نظام کو قبول نہیں کرتے ،ان کو پہلے مسلمانوں کے نظریہ کو سنجیدگی اور انصاف سے پڑھنا اور سمجھنا ہوگا۔آج ہندوستان کا اکثر نہیں بلکہ تمام مسلم طبقہ ہندوستان کے سیکولر نظام پر نہ صرف یقین رکھتا ہے بلکہ اس کے تحفظ اور اس کے وجود کو مستحکم کرنے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔اس کی آئے دن مثالیں ہمارے معاشرے میں دیکھنے اور پڑھنے کو ملتی رہتی ہیں۔اگر مخالفین کی یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ مسلمان سیکولرزم کے خلاف ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اس سیکولرزم کے مخالف ہیں جو انسانیت کو لادینی یا مذہب بیزار بنانے کی طرف راغب کرے۔ہندوستانی آئین کے مطابق تو یہاں تمام اقلیتوں کے دین ودھرم،تہذیب وثقافت اور تشخص وامتیاز کی ضمانت موجود ہے۔

آئین ہنداور مسلم اقلیت:

ہندوستان ایک آزاد جمہوری وسیکولر ملک ہے ،اس کا باقاعدہ ایک دستور ہے جس میں عوام اور ہندوستانی شہریوں کے تمام بنیادی حقوق کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ویکی پیڈیا میں اس کا اس طرح تعارف کرایا گیا ہے:

''جمہوریہ بھارت کا دستور اعلیٰ ہے اس ضخیم قانونی دستاویز میں جمہوریت کے بنیادی ،سیاسی نکات اور ذمہ داریوں نیز بھارتی شہریوں کے بنیادی حقوق،رہنما اصول اوران کی ذمہ داریوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔برصغیر ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک برطانوی راج کے زیرنگیں تھا۔ ہندوستانی آئین کا نفاذ ۲۶/جنوری ۱۹۴۷ء کو ہوا اس کے بعد البتہ مجلس دستور ساز ۲۶/نومبر ۱۹۴۹ء کو تسلیم کیا گیا تھا

اور مکمل نفاذ ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو عمل میں آیا تھا۔ ہندوستانی دستور کے ابتدائیہ میں جو بات کہی گئی ہے۔اس کی بڑی اہمیت ہے۔ہم ہندوستان کے عوام ہندوستان کو ایک خود مختار سوشلسٹ، سیکولر عوامی جمہوریہ کے طور پر قائم کرنے کا مقدس عہد کرتے ہیں اور اس کے تمام شہریوں کو سماجی اور سیاسی انصاف حاصل ہوگا، تمام شہریوں کو اظہار خیال اور عقیدہ، ایمان و عبادت کی آزادی حاصل رہے گی۔سبھوں کو منصب اور مواقع کی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے درمیان بھائی چارہ بڑھایا جائے گا، ہر فرد کی عزت کی ضمانت دی جائے گی اور ملک کے اتحاد و سالمیت کو برقرار رکھا جائے گا۔''

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آئین ہند کے جو الفاظ ہیں ان کو بھی ذیل میں پیش کر دیا جائے:

We The People of India having Solemnly Resolved to Constitute India into a Sovereign Socialist, Secular Democratic Repulic,and to Secure to all its Citizens. Justice, Social,Economic and Political,Liberty of thought, Expression, belief, faith and Worship.

Equality of Status and of

Opportunity and to Promote among

them all.

Fraternity assuring the dignity of the

individual and the unity and The

integrity of the Nation."

وکی پیڈیا نے باباصاحب بھیم راؤ امبیڈکر کی جو رائے نقل کی ہے اس کو یہاں پیش کرنا مناسب ہے:

''یہ درحقیقت ایک طرز زندگی تھا جو آزادی، مساوات اور اخوت کو زندگی کے اصولوں کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے اور یہ اصول ایک دوسرے سے کبھی جدانہیں ہوتے، چنانچہ آزادی مساوات سے جدانہیں ہوتی، مساوات آزادی سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کرتی۔ اس طرح آزادی اور مساوات اخوت سے الگ نہیں ہوئے، آزادی مساوات کے بغیر چند افراد کو برتری عطا کردیتی ہے۔ مساوات آزادی سے ہم رشتہ نہ ہو تو انفرادی اقدامات کو کچل دیتی ہے۔ نیز اخوت کے بغیر آزادی اور مساوات چیزوں کے فطری بہاؤ کو قائم نہیں رکھ سکتے۔''(۱)

چنانچہ ملک میں اب ایک دستور ہے جس میں تمام شہریوں کے حقوق کا ذکر موجود ہے۔ دریں اثنا اب یہ بھی دیکھنا ہے کہ ہندوستانی آئین میں اقلیتوں

---

(۱) وکی پیڈیا

خصوصاً مسلم اقلیت کے کیا کیا حقوق ہیں۔اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے سے قبل معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہندوستانی مذہبی اقلیات کا ذکر کر دیا جائے۔

ہندوستان میں اقلیات:

مرکزی حکومت نے ۲۰۰۶ء میں وزارت برائے اقلیتی امور کی تشکیل کی، جو بھارت کی مذہبی اقلیات کے لیے موجود پروگراموں کو فروغ دینے اور عمل میں لانے کا مرکزی حکومت کا ایک اعلیٰ ادارہ ہے۔قومی کمیشن برائے اقلیت ایکٹ ۱۹۹۲ء کے گزٹ میں شق (ج) کے تحت مسلم،سکھ،عیسائی، بدھ، زرتشت (پارسی) اور جین کو مذہبی اقلیات میں شمار کیا گیا ہے۔البتہ ۲۰۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق بھارت کی کل آبادی ۱۲۰/کروڑ ہے،ان میں ہندوؤں کی تعداد 79.8 فیصد مسلم 14.2 فیصد، عیسائی 2.3 فیصد،سکھ 1.7 فیصد، بدھ 5.7 فیصد،جین 0.4 فیصد ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستانی آئین میں اقلیتوں کے حقوق کیا کیا ہیں؟

آزادی کا حق:

دستور کی دفعہ ۱۹۔تا ۲۲ میں مذکور ہے کہ ہندوستان میں رہنے والے متعدد قسم کی آزادی کے حقدار ہیں۔اس میں اظہار رائے کی آزادی، جیسے: انجمنیں اور تنظیم و تحریک بنانے کا اختیار ہے۔اس کی تفصیل اس طرح بیان ہوتی ہے:

(الف) مملکت کے ہر ایک حصہ میں تقریر اور اظہار رائے کی آزادی۔

(ب) من پسند طریقے سے اور بغیر ہتھیار کے جمع ہونے کا حق۔

(ج) انجمنیں یا یونین قائم کرنے کا حق۔

(د) پورے بھارت میں آزادانہ نقل و حرکت کا حق۔

(ھ) بھارت کے کسی بھی حصے میں بود و باش کرنے اور رہنے کا حق۔

(و) کسی پیشے کے اختیار کرنے یا کسی کام دھندا، تجارت یا کاروبار چلانے کا حق۔

مساوات کا حق:

بھارت میں رہنے والے تمام افراد یکساں حقوق کے حامل ہوں گے، قانونی اورآئینی اعتبار سے ان کے اندر کسی طرح کا بھید بھاؤ یااونچ نیچ جیسی تفریق کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

حقوق واختیارات میں کسی کے ساتھ کسی بھی نوعیت کا فرق نہیں کیا جائے گا۔اسی کوآئین کی دفعہ ۱۴۔۱۵ میں بیان کیا گیا ہے:

مملکت میں کسی شخص کوملک کےاندرقانون کی نظر میں مساوات یاقوانین کے مساویانہ تحفظ سے محروم نہیں کیا جائے گااورمملکت محض مذہب،نسل، ذات، جنس،مقام پیدائش یاان میں سے کسی کی بناء پرکسی طرح کا امتیازنہیں برتے گی۔ سرکاری ملازمتوں کے متعلق باشندگان کوحقوق کا ذکر دفعہ۱۶ میں کیا گیا ہے۔ تہذیبی اورتعلیمی حقوق۔ بھارت چونکہ متعددتہذیبوں اورمتنوع افکار کا مرکز ہے۔ بناءبریں آئین کی دفعہ۲۹ میں کہا گیا ہے:

’’بھارت کے علاقے میں یااس کے کسی بھی حصے میں رہنے والے شہریوں کے کسی طبقے کوجس کی اپنی جداگانہ زبان،رسم الخط یاثقافت ہو،اس کومحفوظ رکھنے کا حق حاصل ہوگا،اسی طرح آئین کی دفعہ۳۰ میں مذکور ہے کہ تمام اقلیتوں کوخواہ وہ مذہب کے نام پرہوں یازبان کے، اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنےاوران کےانتظام کاحق حاصل ہوگا۔‘‘

فکروعقیدہ کی آزادی کا حق:

ہندوستان میں مختلف مذاہب کے متبع اورعلمبردار رہتے ہیں اورانسان کی ضرورت اورفطرت کا تقاضا ہے کہ وہ کسی بھی مذہب کواختیار کرے۔ہرشخص فرد اورکمیونٹی وجماعت چاہتی ہے کہ وہ جہاں بھی رہےاس کے مذہبی حقوق کاتحفظ کیا

جائے، مذہبی حقوق کے تحفظ سے معاشرے میں امن وامان اور باہمی اتحاد وارتباط رہتا ہے۔البتہ ہمارے ملک ہندوستان کو یہ بھی خصوصیت حاصل ہے کہ یہاں تمام مذاہب کا احترام کیا جاتا ہے۔اہم بات یہ ہے کہ صرف احترام نہیں بلکہ معاشرتی اور سماجی اقدار وروایات کے تحفظ کے لیے اور باہمی رکھ رکھاؤ کی خاطر باقاعدہ اقلیتوں کے مذہب کے تحفظ کی ضمانت دستور ہند میں موجود ہے چنانچہ دفعہ ۲۵ میں کہا گیا ہے:

''تمام اشخاص کو آزادی ضمیر اور آزادی سے مذہب قبول کرنے اور اس کی پیروی کرنے کا مساوی حق حاصل ہے۔''

علاوہ ازیں ہندوستان میں رہنے والے تمام افراد کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ انہیں ان کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جاسکتا، جائداد کے خرید وفروخت اور اپنی جائداد سے حاصل شدہ آمدنی کو وہ اپنے اوپر خرچ کرنے کا حقدار ہوگا۔ نیز بھارت میں رہنے والے تمام افراد کو دستوری چارہ جوئی کا بھی حق دیا گیا ہے۔

اقلیتی ادارے:

بھارت سرکار نے اقلیتوں کے تئیں کچھ ادارے بھی ترتیب دیئے ہیں۔جن میں قومی اقلیتی کمیشن نمایاں ہے،اس ادارے کے اختیار میں اقلیتوں کی تعمیر وترقی کے لیے درج ذیل امور سپرد کیے گئے ہیں:

۱۔ اقلیتوں کی ترقی اور ترقی کا جائزہ لینا۔

۲۔ آئین میں بیان کردہ اور پارلیمنٹ اور ریاستوں کی مقنّنہ کونسلوں کے ذریعہ نافذ کردہ قوانین کے مطابق اقلیتوں کے تحفظ سے متعلق کام کی نگرانی۔

۳۔ مرکزی حکومت یا ریاستی حکومتوں کے ذریعہ اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے مؤثر نفاذ کی سفارش کرنا۔

۴۔ اقلیتوں سے متعلق خصوصی شکایات کا جائزہ لینا اور اس طرح کے معاملات متعلقہ حکام کو پیش کرنا۔

۵۔ اقلیتوں کے خلاف کسی بھی طرح کے امتیازی سلوک سے پیدا ہونے والی پریشانیوں کی وجوہات کا مطالعہ کرنا اور ان کے حل کے لیے اقدامات کی سفارش کرنا۔

۶۔ اقلیتوں کی سماجی، اقتصادی اور تعلیمی ترقی سے متعلق مضامین کے مطالعۂ تحقیق اور تجربہ کا بندوبست۔

۷۔ اقلیتوں سے متعلق کوئی مناسب اقدام تجویز کرنا جو مرکزی یا ریاستی حکومتوں کو اٹھانا ہوگا۔

۸۔ مرکزی حکومت کے لیے اقلیتوں سے متعلق کسی بھی معاملات، خاص طور پر ان کو درپیش مشکلات سے متعلق مقررہ وقت یا خصوصی رپورٹ کی تیاری۔

۹۔ کسی بھی دوسرے معاملے کے لیے رپورٹ کی تیاری جو مرکزی حکومت کو پیش کیا جاسکے۔

بالائی سطروں میں آئین ہند میں، ہندوستانی اقلیات کے جن حقوق کا ذکر ہے، ان کی رو سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان باعتبار آئین ایک ایسی ریاست ہے جس کے اندر تمام شہریوں کے بنیادی اور اہم حقوق کا ذکر کیا گیا ہے۔

ہندوستان کی یہی وہ تصویر ہے جو بھارت کو ایک روادار اور سیکولر ملک بنانے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ رہا سوال یہ کہ ہندوستان میں اقلیتوں خصوصاً مسلم اقلیت کی کیا صورت حال ہے تو یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ ہاں اس بابت یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ وقت میں اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کی

تعلیمی، مذہبی، اقتصادی اورسیاسی حالت بالکل ٹھیک نہیں ہے۔اس کی متعدد وجوہات ہیں۔ان میں نمایاں وجہ یہ ہے کہ آئین میں مذکورحقوق کوزمین پر نافذ پوری ایمانداری سے نہیں کیا گیا۔ اگرآئین میں مذکور تمام حقوق کوصحیح معنوں میں نافذکر دیاجا تا تو یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اقلیتوں کی حالت اس قدر دگرگوں نہیں ہوتی۔ہاں ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے آئین میں بلا امتیازوتفریق اورامتیاز وتفاخر کے تمام حقوق سے نوازا گیاہے۔جو ہندوستان جیسے عظیم جمہوری ملک کومقدس مقام عطا کرتا ہے۔

حب الوطنی (نیشنلزم) اور مسلمان:

عام طور پر یہ سوال اٹھتا رہتا ہے کہ مسلمان اپنے وطن یعنی ہندوستان سے محبت نہیں کرتے ہیں یااس طرح کی دیگر باتیں آج کل کہی جاتی رہتی ہیں،وطن سے محبت کوحب الوطنی کہا جاتا ہے،اس کوجدید اصطلاح میں **Nationalism** کہا جاتا ہے۔اس کے دائرہ میں قومیت اور وطنیت جیسے مسائل آتے ہیں،وطنیت وقومیت یاحب الوطنی اوروطن دوستی کے نظریاتی یاجذباتی پہلوبھی ہیں،لیکن ان تمام حقائق پرروشنی ڈالنے سے قبل یہ بات واضح ہوجائے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کوفطری اورجذباتی لگاؤ ہی نہیں ہے بلکہ تاریخ وروایات شاہد ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے وطن ہندوستان کی تمام روحانی،عرفانی،تہذیبی اورقومی قدروں کے فروغ وتحفظ میں پیش پیش رہے ہیں۔گذشتہ ابواب میں راقم نے باہمی امن اور ہندوستان سے محبت کی مسلمانوں کےحوالے سے ہلکی سی جھلک پیش کی ہے۔اب نیشنلزم اورحب الوطنی کے نظریاتی گوشوں کواجاگر کرنے کے بعد یہ بتانے کی سعی کی جائے گی کہ مسلمانوں کے مذہبی متون اوران کے دینی ادب میں وطن سے محبت پرکیا اشارات ملتے ہیں۔یہاں یہ بتانے کی بھی ضرورت ہے کہ گذشتہ کئی

برسوں سے ہندوستان بھر میں مسلمانوں کی حب الوطنی اوروطن دوستی پر رکیک وغیرمہذب نہ صرف حملے ہوئے ہیں بلکہ تعصب وعناد کے بناء پر عتاب وعذاب کا سلسلہ میں جاری رکھا گیا ہے۔مسلم اقلیت ہندوستان کا اٹوٹ حصہ ہیں، ملکی تعمیروترقی یاعوامی فلاح وبہبود کا کوئی منصوبہ یاپروجیکٹ اسی وقت کامل یافتح سے ہمکنار ہوسکتا ہے جب کہ یہاں اقلیتوں پرخصوصاً مسلم اقلیت کو برابر کا شریک وسہیم سمجھا جائے گا۔کسی کا مسلمانوں کی حب الوطنی یاان کی وفاداری اورخلوص پرحرف گیری کرنا،ایسافعل ہے جوملک کے تانے بانے اوررکھ رکھاؤ کو بری طرح مخدوش ومجروح کررہا ہے۔نیشنلزم یاحب الوطنی کسی فرد یاجماعت کی جاگیرنہیں ہے۔اگرکوئی شخص یاقوم وجماعت اس طرح کانظریہ رکھتی ہےتو یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ اس ملک کی صدیوں پرانی گنگا جمنی تہذیب اورقومی یکجہتی کے لیےنقصان دہ ہے۔

جس وقت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے حب الوطنی،قومیت یا وطنیت کے حوالے سےایک رسالہ ''متحدہ قومیت اوراسلام'' کے نام سےلکھا''اس میں وطن سے محبت کااحساس کامل دلانے کی کوشش کی ہے۔'' تواس پرہنگامہ برپاہوا،حتیٰ کہ علامہ اقبال بھی غلط فہمی کا شکار ہوگئے تھےاورانہوں نے باقاعدہ خط وکتابت کےذریعہ مولاناحسین احمدمدنی سے تبادلۂ خیال کیا،یہ بحث''ملت اوروطن '' کے نام سےمحمداکرم خان روزنامہ شمس کے مدیر نے جمع کرکے۱۹۶۸ء میں شائع کیاہے۔اس طرح سیدسرورشاہ گیلانی مدیرمجلّہ علوم اسلامی دہلی نے''متحدہ قومیت اوراسلام'' کےعنوان سےشائع کیاہے۔یہ تمام مباحث قابل مطالعہ ہیں۔

نیشن یاقومیت:

لفظ قومیت عربی زبان کالفظ ہے،جس کا مادہ ہے۔ق۔و۔م ہےاس کا

مفہوم ماہرین نے الگ الگ بیان کیا ہے۔

القومیہ سے مراد مذہبی یا وطنی یا لسانی رشتہ جس کے تحت مخصوص قسم کا اتحاد قائم ہو جاتا ہے، جذباتیت کو اس میں زیادہ دخل ہوتا ہے۔ (۱)

فرہنگ آصفیہ نے اس کا معنی آدمیوں کا گروہ، فرقہ، خاندان، خانوادہ اور نسل کے بیان کئے ہیں۔ (۲)

قومیت کا اصطلاحی مفہوم بتانے سے قبل یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اس کی ابتداء باقاعدہ مغرب سے ہوئی چنانچہ مغربی مفکر **Gellner** اپنی کتاب **"Nations and Nationalism"** میں لکھتا ہے:

> **"A Principle Which holds that the political and the national unit should be Congruent."(3)**

اس طرح ایک اور مغربی مفکر نے نظریہ قومیت کو دو طرح سے تقسیم کیا، جس میں **Cultural Nationalism** اور **Statist Nationalism** شامل ہیں۔ اس ضمن میں یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نظریہ قومیت کا آغاز وارتقاء کسی طرح ہوا؟

اس بابت ماہرین نے متعدد آراء پیش کی ہیں۔ مثلاً انیسویں صدی کا آفتاب بھرپور عید بن کر طلوع ہوا۔ اور اسے **The age of Nationalism** کا نام دیا گیا۔ اسی طرح ایک نظریہ یہ پایا جاتا ہے:

''اس کا نقطۂ آغاز صلیبی جنگوں کے بعد یورپ پر قومیت کے

---

(۱) کیرانوی، وحیدالزماں قاسمی (مولانا) القاموس الوحید، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص: ۱۳۷۰۔۱۳۷۱

(۲) دہلوی، سید احمد، فرہنگ آصفیہ، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ اردو بازار لاہور، س۔ن۔ص: ۴۰۲۔۴۰۳

(۳) Nation and Natioanalism P:713

نظریہ میں پناہ تلاش کی گئی اور وطنی بقاء وسالمیت کی خاطر
قومیت کی چھاؤں تلے سایہ تلاش کیا گیا، وہ کلیسائی نظام جو
صدیوں سے یورپ کی ذہنی غلامی کا سبب بنا ہوا تھا، قومیت
اورقوم پرستی کے ہاتھوں اس کا حصار کمزور ہوگیا اور عیسائی
معاشرہ عقائد کے اعتبار سے دو طبقوں پروٹیسٹینٹ اور کیتھولک
میں مقید ہوگیا۔"(۱)

اس طرح جب اس کو **Nationalism** کا نام دے دیا گیا تو دو عالمی جنگیں اسی بنیاد پر لڑی گئیں، جرمنی میں ہٹلر نے نسلی برتری کے اصول نازی ازم کے ذریعہ انسانیت کش ظلم وستم کا جواز فراہم کیا اور انسانیت پر تشدد و بربریت کی انتہا کردی۔ مزید برآں ایک تبدیلی یہ بھی پیدا ہوئی کہ نوآبادیاتی نظام پر بھی کاری ضرب لگی اور محکوم قوموں میں قومیت کی بناء پر بیداری کی لہر پیدا ہوئی۔ نظریۂ قومیت ایک تحریک بن کر بیشتر افریقی اور ایشیائی ممالک کے لیے قومی بقاء کا پیغام ثابت ہوا۔ (۲)

مذکورہ حقائق کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو نظریہ مغرب میں قومیت کا پایا جاتا ہے اس میں کسی بھی طرح توازن واعتدال نہیں ہے، اسی طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس نظریہ کی ابتدا ایک خاص مقصد کے تحت عمل میں آئی ہے، مسلم مفکرین میں بھی اس نظریہ کے بہت سے لوگ مخالف ہیں جیسے مولانا مودودیؒ، علامہ اقبال، جمال الدین افغانی اور سید قطب شہید وغیرہ کا نام درج ہے۔ کچھ مفکرین اسلام اس نظریہ کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں اس سے مراد باہمی اتحاد و

(۱) طاہرہ، نیر (ڈاکٹر)، اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار، ۱۹۷۷ء، تا ۱۹۷۱ء، انجمن ترقی اردو پاکستان گلشن اقبال کراچی، ۱۹۹۹ء، ص: ۱۹

(۲) ایضاً، ص: ۲۰

اتفاق ہے اوراس کے اشارات قرآن وحدیث میں بخوبی ملتے ہیں۔جولوگ قائل ہیں ان میں مولانا حسین احمد مدنی ،مولانا ابوالکلام آزاد،ضیاء گوگ الپ، مصطفیٰ کمال اتاترک اور جمال عبدالناصر وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

نیشنلزم اور مفکرین اسلام:

قومیت کا تصور مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب ''اسلام اور نیشنلزم'' میں اس طرح لکھا ہے:

> ''قومیت کیا ہے؟انسان کی اجتماعی زندگی کے احساس و اعتقاد کی ایک خاص حالت کا نام ہے، یہ انسانوں کے کسی ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے ممتاز کرتی ہے،اوراس کے ذریعہ اس کی ایک بڑی جمعیت باہم مربوط ہوکر زندگی بسر کرتی ہے۔''(۱)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ انسان کا احساس اجتماع بھی تدریجی ترقی کا ایک پورا ارتقائی سلسلہ ہے:

> ''قومیت اور وطنیت انسان کے اجتماعی رشتہ کی ایک خاص حالت کا نام ہے۔''(۲)

مولانا ابوالکلام آزاد نے وطن دوستی اور تحفظ وطن کے حوالے سے قومیت ونیشنلزم کا جو تصور پیش کیا ہے وہ بڑا جامع اور فائدہ مند ہے:

> ''اسلام کی دعوت ''انسانیت'' اورانسانی برادری کی دعوت تھی،اس لیے اس کا رجحان ان تمام تعصّبات کے خلاف تھا جونسل ووطن کے امتیاز سے پیدا ہوگئے تھے،اسلام کی روح

(۱) ابوالکلام آزاد،(مولانا)اسلام اور نیشنلزم،البلاغ بک ایجنسی نمبر۵، گولمنڈی لاہور، ۱۹۲۹ء،ص:۱

(۲) ایضاً،ص:۲۰

جس چیز کی مخالف ہے وہ صاف اور معین صورت میں کیا ہے؟ دو چیزیں ہیں ایک نسل و وطن کا تحفظ، ایک نسل و وطن کا تعصب ہے۔ اسلام کی روح تعصب کی مخالف ہے، تحفظ کی مخالف نہیں ہے۔''(۱)

گویا وطنیت اور قومیت کا وہ تصور جو انسانوں کو نسلی افتخار اور کسی طرح کے تعصب پر ابھیختہ کرے اسلام اس کی قطعی اجازت نہیں دیتا ہے، البتہ وہ اتحاد اور وحدت جس میں تحفظ و صیانت اور ملی و قومی ہمدردی کا جذبہ پایا جائے اس کی اجازت اسلام میں موجود ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی یہی موقف ہے، اس طرح سرسید بھی قومی یکجہتی اور حب الوطنی کے سچے علمبردار تھے، انہوں نے قوم سے مراد ہندو اور مسلمان دونوں کو لیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے، یہی وہ معنی ہیں جس میں لفظ نیشن کی تعبیر کرتا ہوں، میرے لیے یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے؟ ہم سب کے فائدہ کے مخرج ایک ہیں۔''(۲)

''ہندو ہونا یا مسلمان ہونا انسان کا اندرونی خیال یا عقیدہ ہے جس کو بیرونی معاملات اور آپس کے برتاؤ سے کچھ تعلق نہیں۔''(۳)

سرسید کی باہمی اتحاد اور وطن دوستی کی مساعی کو خواجہ الطاف حسین حالی نے ان الفاظ میں لکھا ہے:

---

(۱) ایضاً ص:۳۲

(۲) لاہور کی انڈین ایسوسی ایشن کی تقریر سے ماخوذ

(۳) مجموعہ لیکچرس، ص:۲۳۲۔۲۳۳

''تہذیب الاخلاق نے جہاں تک ہوسکتا تھا تعصب کی جڑ کاٹی، تقلید کی بندشیں توڑی، مذہبی تحریروں میں آزادی کی روح پھونکی، مذہبی حمایت کا فرسودہ طریقہ جو اس زمانہ میں کچھ کارآمد نہ تھا، اس کی جگہ دوسرا طریقہ جو زمانے میں مناسب حال تھا، جاری کیا۔''(۱)

اسی طرح ایک دوسری جگہ سرسید نے کہا:

''درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں باعتبار اہل وطن ہونے کے ایک ہیں اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبودی ممکن ہے اور آپس کے نفاق اور ضد و عداوت، ایک دوسرے کی بدحواسی سے ہم دونوں برباد ہوجائیں گے۔''(۲)

سرسید نے وطن دوستی اور حب الوطنی کے حوالے سے جو مثبت اور ہم آہنگ تجویز پیش کی تھی، آج بھی ضرورت ہے کہ ان کے اس قول پر سختی سے عمل کیا جائے تاکہ وطن کی تعمیر و ترقی میں چار چاند لگ سکیں۔

وطنیت اور قومیت کے اس مفہوم کو رئیس القلم مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی تحریر کیا ہے، اور سب کو ایک قوم قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''پھر قرآن نے کس بنیاد پر ان جماعتوں اور امتوں کو ان مختلف پیغمبروں کی قوم قرار دیا ہے؟ اس کے سوا اور کیا تھا کہ جو پیغمبر انسانوں کی جس جماعت کی اصلاح و احیاء کے لیے

---

(۱) الطاف حسین حالی، حیات جاوید، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء، ص: ۳۵۸

(۲) یکجہتی کی توسیع میں علماء دیوبند کا کردار، مضمون نگار مولانا اجرار احمد قاسمی، ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ: ۴، جلد: ۱۰۱، ۲۰۱۷ء

کھڑا کیا جاتا تھا ۔ وہی لوگ اس کی قوم قرار دیئے جاتے تھے۔اب اگراسی بنیاد پر ہندوستان کے مسلمان، ہندوستان کے ان تمام باشندوں کوجن کی ہدایت وارشاد،ان کا دینی فریضہ ہے اورجن کو اندھیرے سے روشنی میں لانے کے لیے،مسلمانوں کی ایک جماعت ،گنگا اور جمنا کے کنارے کرشنا اور گوداوری کی وادیوں میں آباد کی گئی۔ان کے اسلاف اس غرض سے اس ملک میں آئے ،اگر مسلمان ان ساری جماعتوں کواپنی قوم قرار دیں،تو قرآن کی اصلاح سے کیا اس کی توثیق نہیں ہوتی؟ یقیناً اس بنیاد پر ہندی مسلمانوں کی قوم، ہندوستان کے قدیم قبائل دراوڑی ،کول اوربھیل بھی ہیں۔آریہ اور راجپوت بھی ہیں،کائستھ اور برہمن بھی ہیں کہ ان لوگوں کے لیے،ان ہی کی اصطلاح و درستی کے لیےاس ملک میں وہ آئے اور ہندوستان میں قیام کیا، یقیناً اسی اصلاح کی بنیاد پرچینی مسلمانوں کی قوم چین کے وہ باشندے ہیں جن کی طرف چین کے مسلمان مبعوث تھے اور قسطنطنیہ وتھیرس، بلقان،البانیہ ، ہرزی گوئیا و بوسنیا کے مسلمانوں کی قوم ، یورپ کے وہ باشندے ہیں جوان ملکوں میں ان کے ساتھ آئے ہیں ،قازون وسرائے باغیچہ کے مسلمانوں کی قوم روس کے وہ باشندے ہیں جن کے درمیان مسلمانوں کی یہ جماعت آبادہوگئی ہے۔مصری مسلمانوں کی قوم ان زمینوں کی رہنے والی ہے جوارد گرد

ممالک میں رہتے ہیں اور جن کو اسلام کی دعوت دینا ان کا قرآنی فریضہ ہے۔''(۱)

اس طویل بحث کے بعد نتیجے کے طور پر تحریر کرتے ہیں:

''الغرض قوم کے لفظ کو قرآن نے جس مفہوم میں استعمال کیا ہے، ہم کبھی غلطی نہیں کریں گے، اگر اس قرآنی اصطلاح کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے ہندوؤں، بودھوں، جینیوں اور اچھوتوں کو اپنی قوم قرار دیں اور اس تبلیغی علاقہ کی وجہ سے اگر ہندی مسلمان، ہندوؤں کے بھائی اور ہندوان کے بھائی سمجھے جائیں، تو قرآن سے بجز اس دعویٰ کے اور کس دعویٰ کی تصدیق ہوسکتی ہے۔''(۲)

مذکورہ شواہد واقتباس کی رو سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن میں لفظ قوم جہاں جہاں استعمال ہوا ہے اس کے اندر بہت وسعت اور ہمہ گیری ہے۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان ایک داعی قوم ہے، اس بناء پر اسے اپنے معاملات دیگر تمام قوموں سے بہت زیادہ خوشگوار رکھنے کی ضرورت ہے، تاکہ جو فریضہ سونپا گیا ہے اس کا بخوبی حق ادا ہو سکے، اسی طرح یہ بھی کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان جیسے تکثیری سماج میں اگر ہندو مسلم کے ساتھ ساتھ دیگر تمام قومیں یکجائی اور مرکزیت کے ساتھ رہیں گی تو اس کے نتائج قومی اور ملکی سطح پر خوش کن اور اطمینان بخش ثابت ہوں گے۔ تحریک ریشمی رومال کے بانی سرخیل مجاہد آزادی مولانا محمود حسن دیوبندی نے قومی یکجہتی اور وطن دوستی کے حوالے سے جمعیت علماء ہند کے عمومی اجلاس (منعقدہ ۱۹۲۰ء) میں ہندو مسلم

---

(۱) گیلانی، مظفر، مضامین مولانا گیلانی، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، ۱۹۸۴ء، ص: ۱۱۷۔۱۱۸

(۲) ایضاً، ص: ۱۱۸

اتحاد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا:

''کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر تعداد (ہندو) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنادیا ہے، اور میں ان دونوں کے اتفاق واجتماع کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حال اگر اس کے خلاف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ناممکن بنادے گی اور دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا۔ اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقش باقی رہ گیا ہے تو وہ ہماری بداعمالیوں سے مٹ کر رہے گا، اس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں عنصر، بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر اگر صلح وآشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقت ورہو ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر واستبداد سے شکست دے سکے گی۔''(۱)

مولانا حسین احمد مدنی نے وطن دوستی، حب الوطنی اور نیشنلزم یا راشٹر واد کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ کسی کی نظروں سے مخفی نہیں ہے۔ اس کا ذکر آچکا ہے کہ انہوں نے ''متحدہ قومیت اور اسلام'' کے حوالے سے ایک رسالہ بھی تحریر کیا

(۱) ابوسلمان شاہ جہاں پوری، شیخ الہند مولانا محمود حسن، ایک سیاسی مطالعہ، زید بک ڈپوئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص: ۲۱۵۔ ۲۱۶

تھا،بعض دیگر مفکرین ومدبرین نے اس کے جواب بھی تیار کیے تھے۔مولانا حسین احمد مدنی نے لکھا ہے:

> ''موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں،نہ کہ نسل اور مذاہب سے،قوم کا اطلاق ایسی جماعت پر کیا جاتا ہے جس میں کوئی وجہ جامعیت ہوخواہ وہ مذہب ہو یا وطنیت یا نسل یا پیشہ یا رنگت یا کوئی اور صفت معنوی یا مادی وغیرہ۔یہ دعویٰ کہ اسلام کی تعلیم ،قومیت کی بنیاد،جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسائی کے بجائے شرف انسانی اوراخوت بشری پر رکھتی ہے، مجھے معلوم نہیں کہ کونسی نص قطعی یا ظنی سے ثابت ہے۔''(۱)

مذکورہ شواہد حب الوطنی،قومیت اوروطن دوستی کے تصور کو کس قدر تقویت بخشتے ہیں تاہم حضرت مدنی نے متحدہ قومیت کے تصور کو اسلامی اور تاریخی بنیادوں پر مدلل کر کے ملک کے طول وعرض میں متعارف کرایا،اس کے بعد علمی حلقوں میں جو واویلہ مچا تھا وہ سب جانتے ہیں۔البتہ مولانا مدنی کے نیشنلزم،راشٹر وادا اور حب الوطنی پر مذکورہ رسالہ اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کے باوجود بھی ہماری حب الوطنی پر شک کیا جائے تو پھر یہ بات نرے تعصب پر مبنی ہے۔علاوہ ازیں مولانا حسین احمد مدنی نے ایک اور کتاب فضائل ہند، یا وطنی عقیدت ومحبت میں تحریر کی تھی اس کا نام انہوں نے ''ہمارا ہندوستان اوراس کے فضائل'' رکھا تھا اس کتاب میں مولانا مدنی نے ہندوستان کو مسلمانوں کا آبائی وطن بتایا ہے اوراس کے باقاعدہ دلائل پیش کیے ہیں۔

---

(۱) رازی،(مولانا) متحدہ قومیت اوراسلام،دفتر اشاعت سیرت مصری شاہ لاہور،ص:۳۰

اس کتاب میں ایک مضمون مولانا محمد میاں کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے، اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے، ان کے بزرگوں کو ہندوستان آئے ہوئے اور رہتے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ آج بھی ہندوستان کے چپے چپے پر مسلمانوں کی شوکت و وقعت کے آثار موجود ہیں۔ جو زبان حال سے ان کی علم و ہنر مندی، حب الوطنی کی شہادت دیتے ہیں موجودہ نسل کا خمیر ہندوستان کی آب و گل سے ہے۔ ہندوستان میں ان کی مذہبی و تمدنی عظیم الشان یادگاریں ہیں۔ بناء بریں ان کو ہندوستان سے ایسی محبت ہے جیسی کہ ایک سچے محبّ وطن کو ہونی چاہئے۔''(۱)

ان تمام باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے وطن سے محبت اور وطن دوستی کو اپنا حرز جاں بنایا ہے اسی وجہ سے مولانا حسین احمد مدنی نے لکھا ہے:

''ہندوستان کی بسنے والی قوموں میں صرف مسلمان ایسی اقوام قدیمہ میں سے ہیں جن کا مذہب اور عقیدہ یہ ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور انسانی نشو ونما قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق حضرت آدمؑ سے ہوا ہے۔ باقی اقوام ہندیہ اس کی قائل نہیں ہیں۔ اسلامی کتابیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان میں اتارے گئے اور یہاں ہی انہوں نے سکونت اختیار کی اور یہاں سے ان کی

---

(۱) مدنی، حسین احمد (مولانا) و محمد میاں (مولانا) ہمارا ہندوستان اور اس کے فضائل، دفتر جمعیۃ دہلی، ۱۹۷۰ء، ص: ۳۰

نسل دنیا میں پھیلی جیسا کہ ''سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان''
میں مذکور ہے۔ بناء بریں اسلامی روایات اور تعلیمات کے
مطابق عہد قدیم سے ہندوستان مسلمانوں ہی کا ہوگا۔ اور
مسلمانوں کے لیے اس کو اپنا وطن قدیم سمجھنا چاہیئے۔''(۱)

اسی طرح انہوں نے یہ بھی لکھا ہے:

''مسلمانوں کے سوا جو قومیں ہندوستان میں سکونت پذیر چلی
آئی ہیں۔ وہ عموماً اپنے مردوں کو جلا ڈالتی ہیں، اور ان کی راکھ
دریا میں بہا دیتی ہیں یا پارسی اپنے مردوں کو پرندوں کو کھلا
دیتے ہیں، بخلاف مسلمانوں کے وہ اپنے مردوں کو زمین میں
دفن کرتے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کی سکونت، جسمانی، اس
زمین میں بھی مثل دیگر اقوام رہی اور مرنے کے بعد بھی ان کی
سکونت یہاں ہی رہی۔ ان کی قبریں محفوظ رکھی جاتی ہیں،
مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قیامت میں ان ہی قبروں سے ان
کے مردے بھی اٹھیں گے اور جو اجزاء جسم کے قبر میں مٹی
ہو گئے تھے، انہیں اجزاء سے ان کا جسم پھر بنایا جائے گا، لہٰذا
مسلمانوں کی سکونت جسمانی اس سرزمین میں قیامت تک
کے لیے ہے بخلاف دوسری قوموں کے، اسی وجہ سے
مسلمانوں کے قبرستان، روضے، قبے، زیارت گاہیں وغیرہ
وغیرہ موجود ہیں اور مسلمان ان کی حفاظت اور عظمت ضروری
سمجھتے ہیں۔''(۲)

---

(۱) ایضاً، ص: ۳-۴

(۲) ایضاً، ص: ۵-۶

مولانا نے آگے یہ بھی لکھا ہے:

''جس طرح آرین، یونانی، یا دیگر قومیں ہندوستان میں آکر بسیں اورانہوں نے یہاں کھیتیاں کیں، باغات لگائے، مکان بنائے، بودوباش اختیار کیں۔اسی طرح مسلمانوں نے بھی یہاں پہنچ کر یہ اعمال وطریقے اختیار کیے۔پشتہا پشت یہاں گزر گئیں اس لیے دنیاوی زندگی اوراسکے لوازم کی حیثیت سے مسلمان کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں،بالخصوص وہ اقوام جوکہ پہلے سے ہندوستان کی باشندہ ہیں۔آج کوئی یہ دعویٰ کرے کہ ہندوستان مسلمانوں کا وطن نہیں ہے،صرف ہمارا وطن ہے، ہندوستان کی بہبود میں جس طرح دوسری قوموں کی بہبودی ہے،اسی طرح مسلمانان ہند کی بھی بہبودی ہے۔لہٰذا یقیناً اس حیثیت سے بھی ہندوستانی مسلمانوں کو یہ وطن عزیز اور پیارا ہے۔مسلمان اس کو چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ جاسکتے ہیں نہ جائیں گے،مسلمانوں کو یہیں رہنا ہے اور امن وامان کی زندگی گزر بسر کرنا ہے۔''(۱)

اسی طرح مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر میں اورمقدس دینی ادب میں بھی حب الوطنی اوراپنی زمین ووطن سے محبت کے بےشمار ارشادات ملتے ہیں۔

حب الوطنی قرآن وسنت کے تناظر میں:

اپنی زمین اوروطن سے محبت ایک فطری تقاضا ہے،جوشخص جہاں رہتا ہے اسے اس جگہ سے محبت وانسیت پیدا ہوجاتی ہے،حتیٰ کہ دیکھا ہوگا کہ جانور

(۱) ایضاً،ص:۱۰

بھی اپنی جگہ سے محبت کرنے لگتا ہے،اب دیکھنا یہ ہے کہ حب الوطنی اور وطن سے وفاداری کی بابت مسلمانوں کے دینی ادب میں کیا ارشادات وارد ہوئے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو اپنی مقبوضہ سرزمین میں داخل ہونے اور قابض ظالموں سے اپنا وطن آزاد کروانے کا حکم دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّهُ لَكُمْ وَلاَ تَرْتَدُّوا عَلَى أَدْبَارِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِيْنَ (۱)

''اے میری قوم! (ملک شام یا بیت المقدس کی) اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور اپنی پشت پر (پیچھے) نہ پلٹنا ورنہ تم نقصان اٹھانے والے بن کر پلٹو گے۔''

وطن سے محبت اور وفاداری پر قرآن کریم کی یہ آیت بھی واضح طور پر دلالت کرتی ہے۔قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شہر مکہ کو امن کا گہوارہ بنانے کی دعا کرنے کا ذکر درحقیقت اپنے وطن یا حرمت والے شہر سے محبت کی علامت ہے۔قرآن فرماتا ہے:

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هَـذَا الْبَلَدَ آمِناً وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ أَن نَّعْبُدَ الأَصْنَامَ (۲)

''اور (یاد کیجیے) جب ابراہیم (علیہ السلام) نے عرض کیا:

---

(۱) المائدة:۲۱

(۲) ابراهيم:۳۵

اے میرے رب! اس شہر (مکہ) کو جائے امن بنا دے اور
مجھے اور میرے بچوں کو اس (بات) سے بچا لے کہ ہم بتوں
کی پرستش کریں۔''

وطن سے محبت ہی کی بناء پر انہوں نے اپنے لخت جگر کو مکہ مکرمہ میں چھوڑنے کا مقصد بھی اپنے محبوب شہر کی آبادکاری تھا۔ انہوں نے بارگاہِ الٰہ میں عرض کیا:

رَبَّنَا إِنِّیْ أَسْکَنتُ مِن ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ
عِندَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُواْ الصَّلاَةَ فَاجْعَلْ
أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْ إِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ
الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ یَشْکُرُونَ(۱)

''اے ہمارے رب! بے شک میں نے اپنی اولاد (اسماعیل
علیہ السلام) کو (مکہ کی) بے آب و گیاہ وادی میں تیرے
حرمت والے گھر کے پاس بسا دیا ہے، اے ہمارے رب!
تاکہ وہ نماز قائم رکھیں پس تو لوگوں کے دلوں کو ایسا کر دے
کہ وہ شوق و محبت کے ساتھ ان کی طرف مائل رہیں اور انہیں
(ہر طرح کے) پھلوں کا رزق عطا فرما، تاکہ وہ شکر بجالاتے
رہیں۔''

سورہ توبہ کی درج ذیل آیت میں مَسٰکِن سے مراد مفسرین و ماہرین نے مکانات اور وطن دونوں کو لیا ہے:

قُلْ إِن کَانَ آبَاؤُکُمْ وَأَبْنَآؤُکُمْ وَإِخْوَانُکُمْ

---

(۱) ابراہیم:۳۷

وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهِ فَتَرَبَّصُواْ حَتَّى يَأْتِيَ اللّهُ بِأَمْرِهِ وَاللّهُ لاَ يَهْدِيْ الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ (۱)

’’(اے نبی مکرم!) آپ فرما دیں: اگر تمہارے باپ (دادا) اور تمہارے بیٹے (بیٹیاں) اور تمہارے بھائی (بہنیں) اور تمہاری بیویاں اور تمہارے (دیگر) رشتہ دار اور تمہارے اموال جو تم نے (محنت سے) کمائے اور تجارت و کاروبار جس کے نقصان سے تم ڈرتے رہتے ہو اور وہ مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو، تمہارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (عذاب) لے آئے، اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں فرماتا۔‘‘

لہٰذا اِس آیت سے بھی وطن سے محبت کا شرعی جواز ملتا ہے، اسی طرح درج ذیل آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے دیگر نعمتوں کے ساتھ مسلمانوں کو آزاد وطن ملنے پر شکر بجالانے کی ترغیب دلائی ہے:

وَاذْكُرُواْ إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِيْ الأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُون (۲)

---

(۱) التوبۃ:۲۴

(۲) الانفال:۲۶

’’اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم (مکی زندگی میں عدداً) تھوڑے (یعنی اقلیّت میں) تھے ملک میں دبے ہوئے تھے (یعنی معاشی طور پر کمزور اور استحصال زدہ تھے) تم اس بات سے (بھی) خوفزدہ رہتے تھے کہ (طاقتور) لوگ تمہیں اچک لیں گے (یعنی سماجی طور پر بھی تمہیں آزادی اور تحفظ حاصل نہ تھا) پس (ہجرت مدینہ کے بعد) اس (اللہ) نے تمہیں (آزاد اور محفوظ) ٹھکانا (وطن) عطا فرما دیا اور (اسلامی حکومت واقتدار کی صورت میں) تمہیں اپنی مدد سے قوت بخش دی اور (مواخات، اموالِ غنیمت اور آزاد معیشت کے ذریعے) تمہیں پاکیزہ چیزوں سے روزی عطا فرما دی تاکہ تم (اللہ کی بھرپور بندگی کے ذریعے اس کا) شکر بجالاسکو۔‘‘

درج بالا آیاتِ قرآنیہ سے وطن کے ساتھ محبت کرنے، وطن کی خاطر ہجرت کرنے اور وطن کی خاطر قربان ہونے کا شرعی جواز ثابت ہوتا ہے۔

قرآن کریم کے علاوہ احادیث رسول میں بھی وطن سے محبت کا پختہ ثبوت ملتا ہے۔ حدیث، تفسیر، سیرت اور تاریخ کی تقریباً ہر کتاب میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ بن نوفل نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نزولِ وحی کی تفصیلات سن کر تین باتیں عرض کیں:

☆ آپ کی تکذیب کی جائے گی یعنی آپ کی قوم آپ کو جھٹلائے گی۔

☆ آپ کو اذیت دی جائے گی اور

☆ آپ کو اپنے وطن سے نکال دیا جائے گا۔

اِس طرح ورقہ بن نوفل نے بتایا کہ اعلانِ نبوت کے بعد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس واقعہ میں وطن کا ذکر کیا گیا ہے اس واقعہ میں وطن سے الفت بخوبی ثابت ہوتی ہے۔

امام سہیلی نے الروض الانفال میں باقاعدہ یہ عنوان باندھا ہے: **حُبُّ الرَّسُوْلِ صلی الله علیه و آله وسلم وَطْنَهُ** (رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنے وطن کے لیے محبت)۔ اس عنوان کے تحت امام سہیلی لکھتے ہیں کہ جب ورقہ بن نوفل نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا کہ آپ کی قوم آپ کی تکذیب کرے گی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاموشی فرمائی۔ ثانیاً جب اس نے بتایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف و اذیت میں مبتلا کرے گی تب بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ نہ کہا۔ تیسری بات جب اس نے عرض کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے وطن سے نکال دیا جائے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً فرمایا:

اَوَ مُخْرِجِيَّ؟

کیا وہ مجھے میرے وطن سے نکال دیں گے؟

یہ بیان کرنے کے بعد امام سہیلی لکھتے ہیں:

فَفِيْ هٰذَا دَلِيْلٌ عَلٰى حُبِّ الْوَطَنِ وَشِدَّةِ مُفَارَقَتِهِ عَلَى النَّفْسِ. (۱)

''اِس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنے وطن سے شدید

---

(۱) السهيلی، ابی القاسم، عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن احمد السهيلی، الروض الانف فی شرح السيرة النبوية لابن ہشام، محقق عمر عبدالسلام السلامی، داراحیاء التراث العربی، بیروت لبنان، ۲۰۰۲ء، ج:۲، ص:۲۷۳

محبت پر دلیل ہے اور یہ کہ اپنے وطن سے جدائی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کتنی شاق تھی''۔

اور وطن بھی وہ متبرک مقام کہ اللہ تعالیٰ کا حرم اور اس کا گھر پڑوس ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محترم والد حضرت اسماعیل علیہ السلام کا شہر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلی دونوں باتوں پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں فرمایا لیکن جب وطن سے نکالے جانے کا تذکرہ آیا تو فوراً فرمایا کہ کیا میرے دشمن مجھے یہاں سے نکال دیں گے؟ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سوال بھی بہت بلیغ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے الف اِستفہامیہ کے بعد واؤ کو ذکر فرمایا اور پھر نکالے جانے کو مختص فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ واو سابقہ کلام کو ردّ کرنے کے لیے آتی ہے اور مخاطب کو یہ شعور دلاتی ہے کہ یہ اِستفہام اِنکار کی جہت سے ہے یا اِس وجہ سے ہے کہ اُسے دکھ اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ گویا اپنے وطن سے نکالے جانے کی خبر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے زیادہ شاق گزری تھی۔

یہی وجہ ہے کہ ہجرت کرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

مَا الاَطْيَبَکِ مِنْ بَلَدٍ وَالاَحَبَّکِ إِلَيَّ، وَلَوْلَا الاَنَّ قَوْمِي الاَخْرَجُوْنِي مِنْکِ مَا سَکَنْتُ غَيْرَکَ. (۱)

''تو کتنا پاکیزہ شہر ہے اور مجھے کتنا محبوب ہے! اگر میری قوم تجھ سے نکلنے پر مجھے مجبور نہ کرتی تو میں تیرے سوا کہیں اور سکونت اختیار نہ کرتا۔''

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، کتاب المناسک ،باب حرم مکہ

یہاں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صراحتاً اپنے آبائی وطن مکہ مکرمہ سے محبت کا ذکر فرمایا ہے۔

اِسی طرح سفر سے واپسی پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے وطن میں داخل ہونے کے لئے سواری کو تیز کرنا بھی وطن سے محبت کی ایک عمدہ مثال ہے۔ گویا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وطن کی محبت میں اتنے سرشار ہوتے کہ اس میں داخل ہونے کے لیے جلدی فرماتے، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

إِنَّ النَّبِيَّ صلی الله علیه و آله وسلم كَانَ إِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ، فَنَظَرَ إِلٰى جُدُرَاتِ الْمَدِيْنَةِ، أَوْضَعَ رَاحِلَتَهٗ، وَإِنْ كَانَ عَلٰى دَابَّةٍ، حَرَّكَهَا مِنْ حُبِّهَا. (۱)

”حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب سفر سے واپس تشریف لاتے ہوئے مدینہ منورہ کی دیواروں کو دیکھتے تو اپنی اونٹنی کی رفتار تیز کر دیتے، اور اگر دوسرے جانور پر سوار ہوتے تو مدینہ منورہ کی محبت میں اُسے ایڑی مار کر تیز بھگاتے تھے۔“

اِس حدیث مبارک میں صراحتاً مذکور ہے کہ اپنے وطن مدینہ منورہ کی محبت میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے سواری کی رفتار تیز کر دیتے تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے

وَفِي الْحَدِيْثِ دَلَالَةٌ عَلٰى فَضْلِ الْمَدِينَةِ، وَعَلٰى مَشْرُوعِيَةِ حُبِّ الْوَطَنِ وَالْحَنِيْنِ إِلَيْهِ. (۲)

---

(۱) الصحیح البخاری، کتاب فضائل المدینۃ، باب المدینۃ تنفی الخبث

(۲) ابن حجر، العسقلانی، فتح الباری شرح صحیح البخاری، بیروت لبنان، ۱۳۷۹ھ، ج:۳، ص:۶۲۱

یہ حدیث مبارک مدینہ منورہ کی فضیلت، وطن سے محبت کی مشروعیت و جواز اور اس کے لیے مشتاق ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

ایک اور روایت میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ خیبر کی طرف نکلا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کرتا رہوں۔ جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیبر سے واپس لوٹے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُحد پہاڑ نظر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

هٰذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ.

’’یہ پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم بھی اس سے محبت رکھتے ہیں‘‘۔

اس کے بعد اپنے دستِ مبارک سے مدینہ منورہ کی جانب اشارہ کرکے فرمایا:

اللّٰهُمَّ! إِنِّي الاُحَرِّمُ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا كَتَحْرِيمِ إِبْرَاهِيمَ مَكَّةَ .اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَمُدِّنَا.(۱)

’’اے اللہ! میں اس کی دونوں پہاڑیوں کے درمیان والی جگہ کو حرم بناتا ہوں جیسے ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کو حرم بنایا تھا۔ اے اللہ! ہمیں ہمارے صاع اور ہمارے مُدّ میں برکت عطا فرما۔‘‘

یہ اور اس جیسی متعدد احادیث مبارکہ میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے وطن مدینہ منورہ کی خیر و برکت کے لیے دعا کرتے جو اپنے وطن سے محبت کی واضح دلیل ہے۔

---

(۱) الصحيح البخاری، کتاب الجهاد والسير ،باب فضل الخدمة فی الغزو

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب لوگ پہلا پھل دیکھتے تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے کر حاضر ہوتے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے قبول کرنے کے بعد دعا کرتے: اے اللہ! ہمارے پھلوں میں برکت عطا فرما۔ ہمارے (وطن) مدینہ میں برکت عطا فرما۔ ہمارے صاع میں اور ہمارے مد میں برکت عطا فرما۔ اور مزید عرض کرتے:

اللّٰهُمَّ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ عَبْدُکَ وَخَلِيلُکَ وَنَبِيُّکَ، وَإِنِّي عَبْدُکَ وَنَبِيُّکَ وَإِنَّهُ دَعَاکَ لِمَكَّةَ وَإِنِّي أدْعُوکَ لِلْمَدِينَةِ بِمِثْلِ مَا دَعَاکَ لِمَكَّةَ وَمِثْلِهِ مَعَهُ. (۱)

''اے اللہ! ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے، تیرے خلیل اور تیرے نبی تھے اور میں بھی تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں۔ انہوں نے مکہ مکرمہ کے لیے دعا کی تھی۔ میں ان کی دعاؤں کے برابر اور اس سے ایک مثل زائد مدینہ کے لیے دعا کرتا ہوں (یعنی مدینہ میں مکہ سے دوگنا برکتیں نازل فرما)۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی چھوٹے بچے کو بلا کر وہ پھل دے دیتے۔

وطن سے محبت کا ایک اور انداز یہ بھی ہے کہ حضور نے فرمایا کہ وطن کی مٹی رب تعالیٰ کے حکم سے بیماروں کو شفا دیتی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں:

إِنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وآله وسلم كَانَ يَقُولُ لِلْمَرِيضِ: بِسْمِ اللهِ تُرْبَةُ أرْضِنَا، بِرِيقَةِ بَعْضِنَا

---

(۱) شرح الزرقانی علی مؤطا الامام مالک، کتاب الجامع، باب فضل المدينة

يُشْفٰى سَقِيمُنَا بِإِذْنِ رَبِّنَا. (۱)

''حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مریض سے فرمایا کرتے تھے: اللہ کے نام سے شروع، ہماری زمین (وطن) کی مٹی ہم میں سے بعض کے لعاب سے ہمارے بیمار کو، ہمارے رب کے حکم سے شفا دیتی ہے۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ کوئی شخص مکہ مکرمہ سے آیا اور بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس سے پوچھا کہ مکہ کے حالات کیسے ہیں؟ جواب میں اُس شخص نے مکہ مکرمہ کے فضائل بیان کرنا شروع کیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چشمانِ مقدسہ آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَا تُشَوِّقْنَا يَا فُلَانُ. (۲)

''اے فلاں! ہمارا اِشتیاق نہ بڑھا۔''

علامہ زرقانی ''المؤطا'' کی شرح میں لکھتے ہیں:

وَالْاَخْرَجَ ابْنُ إِسْحَاقَ عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ، قَالَ: الْاَصَابَتِ الْحُمّٰى الصَّحَابَةَ حَتّٰى جَهِدُوا مَرَضًا.

''ابن اِسحاق نے الزہری سے روایت کی ہے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت

(۱) الصحیح البخاری، کتاب الطب، باب رقیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(۲) حلبی، علی بن برہان الدین، السیرۃ الحلبیہ، مکتبہ نور، ۱۴۰۰ھ ج:۲، ص:۲۸۳

کی کہ بخار نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دبوچ لیا
یہاں تک کہ وہ بیماری کے سبب بہت لاغر ہو گئے۔"

اس قول کی تفصیل بیان کرتے ہوئے علامہ زرقانی رقم طراز ہیں:

قَالَ السُّهَيْلِيُّ: وَفِي هٰذَا الْخَبَرِ وَمَا ذُكِرَ مِنْ حَنِينِهِمْ إِلٰى مَكَّةَ مَا جُبِلَتْ عَلَيْهِ النُّفُوسُ مِنْ حُبِّ الْوَطَنِ وَالْحَنِينِ إِلَيْهِ. (۱)

امام سہیلی فرماتے ہیں: اِس بیان میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مکہ مکرمہ سے والہانہ محبت اور اشتیاق کی خبر ہے کہ وطن کی محبت اور اس کی جانب اِشتیاق اِنسانی طبائع اور فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور اِسی جدائی کے سبب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بیمار ہوئے تھے۔

قرآن حکیم کی سب سے معروف اور مستند لغت یعنی المفرادت کے مصنف امام راغب اصفہانی نے اپنی کتاب "**محاضرات الادباء**" میں وطن کی محبت کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی گفتگو کا ماحصل سطور ذیل میں پیش ہے۔

لَوْلَا حُبُّ الْوَطَنِ لَخَرَبَتْ بِلَادُ السُّوْءِ .وَقِيْلَ: بِحُبِّ الْاَوْطَانِ عِمَارَةُ الْبُلْدَانِ.

"اگر وطن کی محبت نہ ہوتی تو پسماندہ ممالک تباہ و برباد ہو جاتے (کہ لوگ انہیں چھوڑ کر دیگر اچھے ممالک میں جا بستے، اور نتیجتاً وہ ممالک ویرانیوں کی تصویر بن جاتے)۔"

اسی لیے کہا گیا ہے کہ اپنے وطنوں کی محبت سے ہی ملک و قوم کی تعمیر و

---

(۱) شرح الزرقانی، علی مؤطا الامام مالک، کتاب الجامع، باب فضل المدینة ماجاء فی وباء المدینة

ترقی ہوتی ہے۔

اس کے بعد امام راغب اصفہانی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ جب ایک شخص نے اپنا رزق کم ہونے کی شکایت کی تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے فرمایا:

لَوْ قَنِعَ النَّاسُ بِالاَرْزَاقِهِمْ قُنُوْعَهُمْ بِالاَوْطَانِهِمْ.

''کاش! لوگ اپنے رزق پر بھی ایسے ہی قانع ہوتے جیسے اپنے اَوطان (یعنی آبائی ملکوں) پر قناعت اختیار کیے رکھتے ہیں''۔

اِس کے بعد امام راغب اصفہانی نے **فَضْلُ مَحَبَّةِ الْوَطَنِ** (وطن سے محبت کی فضیلت) کے عنوان سے ایک الگ فصل قائم کرتے ہوئے لکھا ہے:

حُبُّ الْوَطَنِ مِنْ طِيْبِ الْمَوْلِدِ.

''وطن کی محبت اچھی فطرت و جبلت کی نشانی ہے۔''

مراد یہ ہے کہ عمدہ فطرت والے لوگ ہی اپنے وطن سے محبت کرتے اور اس کی خدمت کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے وطن کی نیک نامی اور اَقوامِ عالم میں عروج و ترقی کا باعث بنتے ہیں نہ کہ ملک کے لیے بدنامی خرید کر اس پر دھبہ لگاتے ہیں۔ اسی طرح ایک جگہ یہ بھی درج ہے۔

مِمَّا يَدُلُّ عَلٰى كَرَمِ الرَّجُلِ وَطِيْبِ غَرِيْزَتِهِ حَنِيْنُهُ إِلٰى الاَوْطَانِهِ وَحُبُّهُ مُتَقَدِّمِي إِخْوَانِهِ وَبُكَاؤُهُ عَلٰى مَا مَضٰى مِنْ زَمَانِهِ.(۱)

''آدمی کے معزز ہونے اور اس کی جبلت کے پاکیزہ ہونے پر جو شے دلالت کرتی ہے وہ اس کا اپنے وطن کے لیے

---

(۱) اصفہانی، راغب حسن بن محمد بن المفضل، المحاضرات الادباء ومحاورات الشعراء والبلغاء، دار ارقم بیروت، ۱۹۹۹، ج:۲، ص:۶۵۲

مشتاق ہونا اور اپنے دیرینہ تعلق داروں (یعنی اعزاء واقربا،
رفقاء و دوست احباب اور پڑوسی وغیرہ) سے محبت کرنا اور
اپنے سابقہ زمانے (کے گناہوں اور معصیات) پر آہ زاری
کرنا (اوران کی مغفرت طلب کرنا) ہے۔''

انہی وجوہات واسباب کی بناء پر فلاسفہ کا کہنا ہے کہ:

فِطْرَةُ الرَّجُلِ مَعْجُوْنَةٌ بِحُبِّ الْوَطَنِ. (۱)

''فطرتِ اِنسان کو وطن کی محبت سے گوندھا گیا ہے (یعنی
وطن کی محبت انسانی خمیر میں رکھ دی گئی ہے)۔''

اسی طرح ہمارے اکابرین نے وطن کی محبت اور حب الوطنی پر باقاعدہ کتب تحریر کی ہیں چنانچہ ابن خبیر الاشبیلی (م۵۰۲ھ) نے ''**الفھرسة**'' (ص:۳۴۳، رقم:۱۰۰۶) میں لکھا ہے کہ دوسری تیسری صدی ہجری کے معروف امام ابوعثمان عمرو بن بحر الجاحظ (۱۵۹-۲۵۵ھ) نے وطن کی محبت پر ایک مکمل رسالہ لکھا ہے، جس کا نام ہے: **کتاب حب الوطن. ابن خبیر الاشبیلی** (م۵۰۲ھ) نے ''**الفھرسة**'' میں اس رسالے کی پوری سند کو بیان کیا ہے۔ ۱۹۸۲ھ میں یہ رسالہ لبنان کے ''**دار الکتاب العربی**'' سے ''**الحنین إلی الاوطان**'' کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔

ان تمام آیات قرآنی اور احادیث مبارکہ کا بنیادی طور پر تقاضا یہ ہیکہ انسان جس ملک اور سرزمین میں رہے وہ اس سے محبت کرے اپنے وطن سے وفاداری کو یقینی بنائے ملک کی عظمت وسلامتی اور تعمیر و ترقی کے منصوبوں میں شریک ہو۔ جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے تو صرف اتنا ہی کہنا

(۱) ایضاً ص:۶۵۲

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی کتب قرآن کریم اوراحادیث رسول میں وطن سے محبت کی جو علامات واشارات ملتے ہیں ان پر ایمان لانا اور زندگی کا اپنا نصب العین سمجھنا ضروری ہے۔لہٰذا فطری طور پر بھی ہندوستانی مسلمان اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں اور یہ ان کے ایمان کا بھی جزو ہے۔ان تمام چشم کشا حقائق کے بعد بھی اگر کوئی سر پھرا مسلمانوں کی حب الوطنی اوران کی وفاداری و اخلاص پر کیچڑ اچھالتا ہے تو صرف اس کے لیے یہی کہا جا سکتا کہ یہ تعصب وعناد یا پھر نفرت وتنگ نظری کی بناء پر ایسا کر رہا ہے۔

☆☆☆

باب چہارم:

ہندوستان کی شرعی حیثیت: جدید وقدیم آراء کی روشنی میں

تاریخی پس منظر:

یہ حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد سے ہندوستانی مسلمانوں کو اوران کی تاریخ وتہذیب کو مسخ کرنے کے لیے حکمرانوں سے لے کر دیگر تمام متعصب اور جانبدار تنظیموں و جماعتوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ جب بھی موقع ملا ہے انہوں نے اپنی طاقت وقوت اور حکومت واقتدار کے نشہ میں نہ صرف مسلمانوں کی قربانیوں اوران کے اہم کارناموں کو فراموش کیا بلکہ نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ اب تو ان کے لئے لٹیرا، اور نہ جانے کیسے کیسے ناشائستہ الفاظ استعمال کئے جارہے ہیں۔ جبکہ اگر انصاف کے ساتھ ہندوستان کے قدیم سماج اوراس کی تاریخ وتہذیب کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد باعث رحمت ثابت ہوئی ہے۔ اس کے بہت سارے ثبوت وشواہد مورخین و مصنفین نے اپنی اپنی کتب میں درج کیے ہیں۔ اس حقیقت اور سچائی کو جاننے سے قبل یہ بھی سنجیدگی سے جاننا ہوگا کہ کچھ متعصب مورخین اور مسلم دشمن عناصر نے تاریخ کواس قدر مخدوش بنا کر پیش کیا اور مستقل اس پروپیگنڈہ کی ترویج واشاعت کی گئی۔ آج بھی اسی طرح کے نظریات اور افکار کو بڑی تیزی سے ذرائع ابلاغ اور دیگر اشاعتی اداروں کے توسل سے نشر کیا جارہاہے۔ اس کے پس پردہ کچھ عناصر کا مقصد سیاسی غلبہ اور سیاسی فوقیت وبرتری حاصل کرنی ہے۔ لیکن صداقت کو کبھی بھی نہ مٹایا جاسکتا ہے اور نہ ہی فراموش کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ آج بھی ہندو اور مسلمانوں میں کتنے ایسے مصنفین واسکالرس ہیں جو حقیقت کو حقیقت اور باطل کو باطل کہنے اور لکھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ جولوگ آج کسی بھی وجہ سے غلط فہمیوں میں مبتلا ہوگئے ہیں انہیں تاریخی حقائق کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا

چاہئے۔تاریخ کےان روشن اور غیر جانبدار اوراق کی روحانیت کو پیش کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ بتادیا جائے کہ اسلام کی آمد سے قبل ہندوستان کا سیاسی،سماجی،اقتصادی نظام کیسا تھا؟اور مسلمانوں کی آمد سے ہندوستان میں کیا ترقیات ہوئیں؟ تاکہ جولوگ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کو زحمت تصور کرتے ہیں ان کو حقیقت سے آشنائی ہوسکے۔

ہندوستان کی مذہبی حیثیت:

معروف اسلامی اسکالر مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے اپنی متداول کتاب ''آئینہ حقیقت نما'' میں ایک چینی سیاح کی زبانی ہندوستان کے احوال کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''چین کے مشہور عالم ''ہیونگ شیانگ'' نے اپنے دوران سفر کے احوال بیان کرتے ہوئے بتایا ہے،دوران سفر کئی جگہ ڈاکوؤں کے پنجے میں گرفتاری کا ذکر بھی کرتا ہے،اور ہمیشہ ان (لٹیروں) کو کافر اور بے دین بتاتا ہے حالانکہ وہ برہمنی مذہب کے پیروکار اور بدھ کے مخالف تھے۔''(۱)

اسی طرح مفتی شوکت علی فہمی نے اپنی کتاب'' ہندوستان پر اسلامی حکومت''میں ہندوستان کی مذہبی حالت کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ ہندوستان میں بدھ مذہب کی نشر واشاعت سب سے زیادہ راجہ اشوک کے دور میں ہوئی اس نے بدھ مذہب کو صرف اس لیے قبول کیا کہ اس میں ''اہنسا'' یعنی عدم تشدد کا فلسفہ پایا جاتا ہے اس کے دور حکومت کے بعد اس کی شہنشاہی ٹکڑوں میں منقسم ہوگئی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بدھ کی اصل تعلیمات مسخ

(۱) نجیب آبادی، اکبر شاہ خاں، (مولانا) آئینہ حقیقت نما،نفیس اکیڈمی کراچی پاکستان، دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۸ء، ص:۸۵

ہوگئیں اور عبادت و اخلاق کی بنیاد کھوکھلی ہوکر رہ گئی کیوں کہ اشوک کے عہد کو ۹؍سو برس اور گوتم بدھ کے زمانے کو تقریباً ۲۱؍سو برس ہو چکے تھے۔ [1] اس طرح پورے معاشرے میں بت پرستی کا چلن ہوگیا بدعقیدگی اور دیگر غیر ضروری اعمال میں معاشرہ بری طرح لت پت ہوگیا تھا۔ اس کیفیت کو اکبر شاہ نے اس طرح لکھا:

> ’’یہاں (سندھ) میں عام طور پر بت پرستی رائج تھی، مجرموں کی شناخت کے لیے ان کو جلتی ہوئی آگ میں گزارنے کا عام رواج تھا، اگر آگ میں جل گیا تو مجرم اور بچ گیا تو بے گناہ تھا۔‘‘
>
> وہ آگے لکھتے ہیں: جادو کا عام طور پر رواج تھا، غیب کی باتیں اور شگون کی تاثیرات بتانے والوں کی بڑی گرم بازاری تھی، محرمات ابدی کے ساتھ شادیاں کرلینے میں تامل نہ تھا، چناں چہ راجا داہر نے اپنی حقیقی بہن کے ساتھ پنڈتوں کی ایماء سے شادی کی تھی، راہزنی اکثر لوگوں کا پیشہ تھا، ذات باری تعالیٰ کا تصور معدوم ہوکر اعلیٰ و ادنیٰ پتھر کی مورتوں اور بتوں کو حاجت روا سمجھتے تھے۔‘‘ [2]

ہندوستان میں مسلمانوں کے اولین نقوش:

اس صداقت کو بیان کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا کہ اب مختصر طور پر یہ بتا دیا جائے کہ عرب و ہند کے باہمی تعلقات کا پس منظر کیا ہے۔ اس بابت محمد

---

(۱) (فہمی شوکت علی، (مفتی) ہندوستان پر اسلامی حکومت، بک پوائنٹ کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۲۱۔۲۲)

(۲) آئینہ حقیقت نما، ص: ۱۷۴-۱۷۵

اسحاق بھٹی نے اپنی کتاب ''برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش'' میں نہایت علمی اور تحقیقی گفتگو کی ہے۔ عرب و ہند کے ابتدائی احوال کے متعلق انہوں نے لکھا ہے:

بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی قبل ہندوستان کے مختلف قبائل: زط (جاٹ)، مید، سیابچہ یا سیابجہ، احامرہ، اساورہ، بیاسرہ اور تکرّی (ٹھاکر) جیسی قوموں کے وجود و سکونت کا ثبوت، بحرین، بصرہ، مکہ اور مدینہ میں ملتا ہے۔[1]

اسحاق بھٹی کی تحقیق کے مطابق پتہ چلتا ہے:

> ''زط'' جاٹ برصغیر سے ایران گئے اور وہاں کے مختلف بلاد و قصبات میں آباد ہوئے اور پھر ایران سے عرب پہنچے اور عرب کے کئی علاقوں میں سکونت اختیار کر لی''۔[2]

اسی طرح اسحاق بھٹی نے ان قبائل کے اسلام قبول کرنے کے متعلق درج کیا ہے کہ انہوں نے بزمانۂ خلافت شیخین (حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول فرمالیا۔[3] ان شواہد کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان قبائل کے عربوں سے نہایت خوشگوار تعلقات تھے اور ان کے اس وقت بہت سے اقربا بحر ہند کے ساحل پر رہتے تھے قیاس یہی کہ ان کے بھی ان سے باہم تعلقات درست رہے ہونگے چنانچہ اس طرح سے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں سے تعلقات اور آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا۔ عرب و ہند کے مابین تعلقات میں دھیرے دھیرے وسعت آتی گئی اور باہم شادی بیاہ کا بھی سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان تعلقات کی وسعت تجارت کے توسل سے مزید فروغ پائی۔ اس کو اسحاق بھٹی نے یوں لکھا ہے:

---

(۱) بھٹی، محمد اسحاق، برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۳۔۲۸

(۲) ایضاً، ص ۱۸

(۳) ایضاً، ص: ۵۲

”یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے نت نئے اشیائے خورد ونوش، ناریل، لونگ، صندل، روئی کے مخملی کپڑے، سندھی مرغی، تلواریں، چاول اور گیہوں اور دیگر اشیاء عرب کی منڈیوں میں جاتی تھیں۔“(۱)

عربوں سے تجارتی تعلقات اور یہاں کے بعض قبائل کا مکہ، مدینہ اور بصرہ میں قیام پذیر ہونا یہ ایسا بنیادی سبب ہے جس سے ہندوستان کے بہت سارے علاقوں میں اسلام کا تعارف ہو گیا تھا اور قیاس یہی ہے کہ لوگوں کو اسلام کے متعلق جاننے اور سمجھنے کا اشتیاق بھی بڑھ رہا ہوگا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ عہد فاروقی ۱۵ھ ہی میں مالا بار، اور سراندیپ کے علاقوں میں اسلام کی خوشبو پھیلنا شروع ہوگئی تھی اور لگاتار عہد عثمانیہ سے خلافت امیہ تک یکے بعد دیگرے بہت سے افراد رسالت وتوحید کی روشنی سے منور ہونے کے بعد اس علاقے کو اسلام کی تعلیمات سے ہم آہنگ کررہے تھے اور اسلام بلا کسی رکاوٹ بندش کے لوگوں کے قلوب میں گھر کرتا جارہا تھا اور ان کے دل ودماغ کو مسخر کررہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مالا بار کا راجا ”زمورن یا سامری“ کا واقعہ ”ہندوستان پر اسلامی حکومت“ کے مصنف مفتی شوکت علی فہمی نے تاریخ فرشتہ کے حوالے سے بڑی تفصیل سے لکھا ہے البتہ یہاں اس کا خلاصہ پیش کرنا مفید ہوگا۔ ”زمروں یا سامری“ نے معجزہ شقِ قمر کا چشم دید مشاہدہ کیا اور تاریخ ودن محفوظ کرکے تحقیق شروع کردی معلوم ہوا کہ عرب میں ایک پیغمبر پیدا ہوئے ہیں انھی کا یہ معجزہ تھا“۔(۲) ان تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان کے بہت سے علاقوں اور قبائل میں نہ صرف اسلام کا چرچا ہورہا تھا بلکہ

(۱) ایضاً، ص۲۹
(۲) ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت، ص۳۴

لوگ اسلام بھی قبول کرر ہے تھے یہاں یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا کہ اب تک ہندوستان میں جو اسلام آیا تھا اسے لوگوں نے بخوشی قبول کیا تھا کسی کے ساتھ کوئی زیادتی اور زبردستی نہ کی گئی تھی ۔ اسلام کی تاریخ میں کوئی بھی ایک واقعہ ایسا نہیں ملے گا جس میں زبردستی کسی کو اسلام قبول کرایا گیا ہو۔ اس کے باوجود کچھ ناعاقبت اور متعصب افراد اسلام پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ اسلام کی ترویج واشاعت اور تبلیغ ودعوت کا عمل بزور شمشیر کیا گیا ہے۔ ان کے لئے بس یہ کہا جاسکتا ہے انہیں اسلام کی تعلیمات کا انصاف سے مطالعہ کرنا ہوگا۔ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو یقیناً انہیں کہیں بھی مایوسی نہیں ہوگی۔

ہندوستان کی تعمیر وترقی میں مسلمانوں کا کردار:

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور یہاں کی زمام اقتدار سنبھالنے کے بعد جو تعمیری اور تہذیبی وتمدنی کارنامے انجام دیئے ان کی ایک طویل فہرست ہے جن کا ذکر ان مختصر سطور میں نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ مسلم حکمرانوں نے ہندوستان کو ہر اعتبار سے قابل فخر بنایا اور اس کے تمدنی جلووں کی پوری طرح رعایت کی۔ اسی بابت علامہ شبلی نعمانی نے اپنی کتاب ''اسلامی حکومت اور ہندوستان میں اس کا تمدنی اثر'' میں لکھا ہے:

> ''کسی غیر قوم کا کسی غیر ملک پر قبضہ کرنا کوئی جرم نہیں ورنہ دنیا کے سب سے بڑے فاتح سب سے بڑے مجرم ہوں گے لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ فاتح قوم نے ملک کی تہذیب وتمدن پر کیا اثر پیدا کیا، ''چنگیز خاں'' فتوحات کے لحاظ سے دنیا کا فاتح اعظم ہے، لیکن اس کی داستان کا ایک ایک حرف خون سے رنگین ہے، مرہٹے ایک زمانے میں تمام ہندوستان پر

چھا گئے؛ لیکن اس طرح کہ آندھی کی طرح اٹھے، لوٹا مارا، چوتھ (آمدنی کا چوتھائی) وصول کیا اور نکل گئے، بخلاف اس کے متمدن قوم جب کسی ملک پر قبضہ کرتی ہے تو وہاں کی تہذیب وتمدن دفعتاً بدل جاتی ہے، سفر کے وسائل، رہنے سہنے کا طور طریقہ، کھانے پینے کے طریقے، وضع ولباس کا انداز، مکانوں کی سجاوٹ، گھروں کی صفائی، تجارت کے سامان، صنعت وحرفت کی حالت، ہر چیز پر ایک نیا عالم نظر آتا ہے۔ اور گو مفتوح قوم ضد سے احسان نہ مانے لیکن درودیوار سے شکر گزاری کی صدائیں آتی ہیں۔''(۱)

یہ صداقت بھی تاریخی دستاویزات میں محفوظ ہے کہ ہندوستان پر باضابطہ مسلمانوں کی طویل حکومت کا آغاز سلطان ظہیرالدین بابر سے ہوا اس لیے کہ بابر سے پہلے جو بھی آیا اس کی حکومت محدود علاقے تک رہی چہ جائیکہ محمود غزنوی نے اس میں کافی وسعت پیدا کی، دوسرے یہ کہ ایک کے بعد دوسرے کے آنے تک عرصۂ دراز کا خلا بھی رہا۔ چناں چہ جب بابر نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی تو اس نے جو ترقیاتی اور تعمیری منصوبے ترتیب دیئے ان پر بھی ایک نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی اپنی مذکورہ کتاب میں تحریر کرتے ہیں۔

''اگرچہ ظاہر ہے کہ اس سے قبل کی اسلامی حکومتوں نے بھی ہندوستان کی تہذیب وتمدن کو کچھ نہ کچھ ضرور ترقی دی تھی تاہم بابر نے ترکستان سے آکر ہندوستان کو جس حالت میں دیکھا

(۱) علامہ شبلی نعمانی، اسلامی حکومت اور ہندوستان میں اس کا تمدنی اثر، الناظر پریس لکھنؤ، ۱۹۲۷ص:۱-۲

اس کی تصویر اسی کے لفظوں میں یہ ہے: ہندوستان میں اچھے
گھوڑے نہیں، اچھا گوشت نہیں، انگور نہیں، خریزہ (خربوزہ)
نہیں، برف نہیں، آبِ سرد نہیں، حمام نہیں، مدرسہ نہیں، شمع
نہیں (ایسی روشنی جو ہر جگہ ہر موقع سے کام آسکے) مشعل
نہیں، شمع دان نہیں، باغوں اور عمارتوں میں آب رواں نہیں،
عمارتوں میں نہ صفائی ہے، عام آدمی ننگے پاؤں لنگوٹی لگائے
پھرتے ہیں، عورتیں لنگی باندھتی ہیں جس کا آدھا حصہ کمر سے
لپیٹتی ہیں اور آدھا سر پر ڈال لیتی ہیں۔''(۱)

اس حقیقت کو فراموش کرنا نہ تاریخ سے انصاف ہوگا اور نہ ہی ہندوستان سے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ ہندوستان کو مسلم حکمرانوں نے آباد وشاد نہیں کیا۔ سچ یہ ہے کہ ہندوستان کی جملہ ترقیات میں مسلم حکمرانوں نے بڑی دلچسپی لی ہے اس کے بہت سارے شواہد موجود ہیں۔

چنانچہ'' ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے''، مسلم حکمرانوں کے حوالے سے جو اقتباس درج ہے اس سے ہندوستان کی ترقیاتی اور تعمیری منصوبہ بندی کا اظہار ہوتا ہے۔

''مسلمان اگرچہ ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے آئے
لیکن اجنبی حکمرانوں کی طرح انھوں نے اس کو محض تجارت کی
منڈی اور حصولِ دولت کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ اس کو وطن بنا کر
یہیں رچ بس گئے اور مرنے کے بعد بھی اس کی خاک کے
پیوند ہوئے اس لیے کہ انھوں نے حکومت وسیاست، علم وفن،

---

(۱) ایضاً، ص:۲-۳

صنعت وحرفت، زراعت وتجارت، تہذیب ومعاشرت، ہر حیثیت سے اس کو ترقی دے کر صحیح معنوں میں ہندوستان کو جنت نشاں بنادیا''۔ (۱)

اسی تناظر میں ذیل کا اقتباس بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے چنانچہ علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے:

''ہندو ہمیشہ سے نہایت سادہ لباس پہنتے تھے اور غالباً ان کو گزی گاڑھے کے سوا اور کچھ پہننا نہ آتا ہوگا، (جس کی شہادت گذشتہ سطور میں صراحت سے ملتی ہے) اکبر نے دلی، لاہور، آگرہ، شیخ پور احمد آباد اور گجرات میں پارچہ بافی کے بڑے بڑے کارخانے جاری کیے اور (یہی نہیں بلکہ) ایران، افغانستان، اور چین سے کاریگر بلوا کر ہر قسم کے قیمتی کپڑے تیار کرائے''۔ (۲)

مسلم حکمرانوں کی ہندوستان سے وفاداری اور اس کو ترقی دلانے کے لئے انہوں نے ہر ممکن جد وجہد کی ہے۔ اس صداقت کا اعتراف صرف مسلم مصنفین ہی نے نہیں کیا ہے بلکہ بہت سارے غیر مسلم مصنفین نے بھی کیا ہے اسی میں ایک بہت بڑا نام پنڈت جواہر لال نہرو کا آتا ہے۔ مولانا علی میاں ندوی نے اپنی کتاب '' ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ اور موجودہ صورت حال کی عکاسی'' میں پنڈت نہرو کا ایک اقتباس ان کی معروف کتاب **Discovery of India** (اس کتاب کا اردو ترجمہ تلاش ہند کے نام سے ہوا ہے) کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔ ضمناً یہ بتانا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سچائی اور جھوٹ

---

(۱) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے، ص:۱

(۲) اسلامی حکومت اور ہندوستان میں اس کا تمدنی اثر، ص:۷

میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سچ ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور جھوٹ کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔اس لئے مسلمان حکمرانوں کے تعلق سے جتنے بھی شکوک وشبہات پھیلائے گئے اس کے باوجود لوگوں نے حقیقت کو پڑھا اور اس کو آگے بھی بڑھایا۔ پنڈت نہرو کا ذیل کا اقتباس اسی کی شہادت ہے۔

''ہندوستان میں اسلام کی اور ان مختلف قوموں کی آمد نے جو اپنے ساتھ نئے خیالات اور زندگی کے مختلف طرز لے کر آئے، یہاں کے عقائد اور یہاں کی ہیئت اجتماعی کو متاثر کیا، بیرونی فاتح خواہ کچھ بھی برائیاں لے کر آئے اس کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے، یہ عوام کے ذہنی افق میں وسعت پیدا کر دیتی ہے اور انھیں مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنے ذہنی حصار سے باہر نکلیں، وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دنیا اس سے کہیں زیادہ بڑی اور بوقلموں ہے جیسا کہ وہ سمجھ رہے تھے۔

بالکل اسی طرح افغان فتح نے ہندوستان پر اثر ڈالا اور بہت سی تبدیلیاں وجود میں آ گئیں، اس سے بھی زیادہ تبدیلیاں اس وقت ظہور میں آئیں جب مغل ہندوستان میں آئے، کیوں کہ یہ افغانوں سے زیادہ شائستہ اور ترقی یافتہ تھے، انھوں نے ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ اس نفاست کو رائج کیا جو ایران کا حصہ تھی۔''(۱)

اسی طرح انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں جنگ آزادی کے ایک اور رہنما ''ڈاکٹر ستیا رَمیّہ نے بھی مسلم حکمرانوں کی کوششوں اور ان کے فلک بوس

---

(۱) ندوی، علی میاں، (مولانا) ہندوستانی مسلمان، مجلس تحقیقات نشریات اسلام پوسٹ بکس لکھنؤ، ۱۹۹۲ء، ص: ۳۰

کارناموں کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''مسلمانوں نے ہمارے کلچر کو مالا مال کیا ہے اور ہمارے نظم ونسق کو مستحکم اور مضبوط بنایا نیز وہ ملک کے دور دراز حصوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کامیاب ہوئے، اس ملک کے ادب اور اجتماعی زندگی میں ان کی چھاپ بہت گہری دکھائی دیتی ہے۔''[1]

یہ ہیں بین ثبوت اور مسلم حکمرانوں کے طرز حکومت کے چشم کشا تعمیری کارنامے اس کے باوجود اگر کوئی شخص یا کوئی تنظیم وتحریک یہ کہے کہ مسلم حکمرانوں نے ہندوستان کی عوام اور یہاں کے باشندوں کے ساتھ ناانصافی کی تو پھر یہی کہا جاسکتا ہے ایسے افراد کو نہ تو تاریخ کا علم ہے اور نہ ہی اس کے اندر سچ وحق کہنے کی جرات وہمت ہے۔ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان کی رعایا کے ساتھ کسی بھی طرح کا ناروا یا جانبداری کا معاملہ نہیں کیا۔ آج سب سے زیادہ جو موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے وہ اورنگزیب عالمگیر کو لیکن جب ہم اس کی طرزِ حکمرانی اور عدل پروری کے واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں تو پھر اندازہ ہوتا ہے جو لوگ بھی اورنگزیب عالمگیر پر الزام عائد کرتے ہیں وہ حق بجانب نہیں ہیں۔ اس کے لیے ذیل کی صرف ایک مثال پیش کرنا کافی ہوگا۔

چنانچہ محمود علی نے اپنی کتاب ''عہد وسطی میں مشترکہ تمدن اور قومی یکجہتی میں''، بشمبر ناتھ پانڈے کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جو رواداری، عدل پروری اور اس کی امانت ودیانت پر بین ثبوت ہے۔ اب خود وہ مورخ اپنی فہم کو وسیع کرے جس نے بہار کے کالج میں داخل شدہ ایک کتاب میں صاف طور پر یہ سوال قائم کر دکھایا

---

(۱) ایضاً، ص: ۳۰

ہے:

''اورنگ زیب نے مندر منہدم کروا کر کون سی مسجد تعمیر کروائی''
اور جناب پانڈے اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ آگے مزید گویا ہیں: مہا کال مندر (اجّین)، بالا جی مندر (چتر کوٹ) کا ماکھیہ مندر (گوہاٹی) جین مندر (گرنار) گرودوارا رام رائے (دہرادون) وغیرہ کو (عالمگیر نے) جاگیر عطا کرتے وقت اس دعا کی ہدایت کی کہ اس کے خاندان میں تا قیامت حکومت بنی رہے۔''(۱)

آج ہندوستان میں ایک مخصوص نظریہ کو پروان چڑھایا جارہا ہے اور اس نظریہ یا فکر کے فروغ پانے یا اقتدار حاصل کرنے میں جو چیزیں سد باب بن رہی ہیں خواہ وہ تاریخ کے قبیل سے ہوں یا پھر وہ مذہب، ذات پات کے قبیل سے سیاسی قوت کے بل بوتے انہیں دبایا جارہا ہے، حقیقت کو پوشیدہ رکھا جارہا ہے۔ان چیزوں اور موجودہ احوال پر گہرائی سے نظر رکھنی ہوگی۔ایسا نہ ہو ہماری غفلت کی وجہ سے کوئی ایسی جدید تاریخ مرتب نہ کردی جائے جو اصل تاریخ اور مسلم حکمرانوں کے شاندار کارناموں اور پرافتخار نمونوں پر دبیز چادر ڈال دے۔ اس لئے ہندوستانی معاشرے کے سیاسی احوال اور اس کے افکار ونظریات کو نہ صرف سمجھنا ہوگا بلکہ ان کا نظریاتی طور پر مطالعہ بھی کرنا ہوگا۔ ہندوستان کثرت کے لیے جانا جاتا ہے اور یہی اس کا نمایاں امتیاز ہے اس کے اس تشخص کو ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اس کے فروغ کے لیے باقاعدہ اقدامات بھی کیے تھے۔

(۱) محمود علی، عہد وسطیٰ میں مشترکہ تمدن اور قومی یکجہتی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ اُردو بازار نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص:۱۵۶

ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یہ مسئلہ اکابر واسلاف اور بیشتر علماء کے یہاں مختلف فیہ رہا ہے،اس کی بنیادی وجہ راقم کی نظر میں یہ ہے کہ ہمارے متقدمین فقہاء نے ''دار'' کوکئی اقسام یعنی دارالحرب،دارالاسلام ، دارالامن اوردارالمعاہدہ وغیرہ میں تقسیم کیا ہے۔پھران کے الگ الگ احکام بھی بتائے ہیں۔چنانچہ ان تمام مباحث سے قطع نظراب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان ایک آزاد ریاست اوردستوری وسیکولر ملک ہے،اس ملک کی بھی کئی حیثیتیں رہی ہیں۔ایک دورتو وہ تھا جب ہندوستان میں مسلم حکومت تھی اور یہ دورکافی طویل ہے۔اس کے بعد ہندوستان میں فرنگی یاانگریز آئے اور ملک کی زمام اقتدار ان کے تسلط میں چلی گئی۔پھر یہ کہ ہندوستان کوانگریزوں کے پنجۂ استبداد سے آزاد یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر کرایا۔تب سے یہ ایک آزاد ملک ہے،اور یہاں کا باقاعدہ آئین ودستور ہے جوسیکولرافکارونظریات پرمبنی ہے۔بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں کسی بھی خاص فکر/ مذہب/ طبقہ کی حکومت نہیں ہے بلکہ یہاں کا نظام اورقانون سب کے لیے یکساں حقوق فراہم کرتا ہے،خواہ وہ کسی بھی مذہب اورطبقہ یاقوم سے وابستہ ہو،لہٰذا ہندوستان کی شرعی حیثیت کو بتانے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ بتادیا جائے کہ ہندوستان میں انگریز آئے توانھوں نے کس طرح ملک کے تانے بانے اور یہاں کی دیگراقدار کو پامال کیا، بالائی سطروں میں یہ بتایا گیا کہ ہندوستان میں جب مسلمان آئے توانھوں نے اس ملک کورفعت وبلندی سے ہم کنار کیا، برعکس اس کے انگریزوں نے ہرطرح سے ہندوستان کو برباد کیا۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد:

یہ بات توبالکل ظاہروباہر ہے کہ ہندوستان پرانگریزوں نے تسلط جمالیا

تھااوراس کے لیے باقاعدہ جدوجہد ہوئی،آزادی کی لڑائی لڑی گئی،تمام تفصیلات بہت ساری کتب میں موجود ہیں۔ یہاں دیکھنا یہ ہے کہ جس وقت ملک غلام ہوگیااس وقت یہ سوال اٹھا کہ اب تک تو ہندوستان ایک اسلامی ریاست کی شکل میں تھا،اب جبکہ اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو چکاہے اور پورے طور پر ملک پرفرنگیوں کی حکومت قائم ہوگئی اس وقت انہوں نے ملک کی معاشی،سماجی،سیاسی اور مذہبی قدروں کو جونقصان پہنچایا وہ سطور ذیل میں ملاحظہ کیجئے:

تجزیہ نگاروں اور مؤرخین نے لکھا ہے کہ مغلیہ حکومت کا زوال اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد شروع ہوگیااور ملک کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ بالآخر ہندوستان پر کمپنی کی حکومت غالب آ گئی اور ملک کی معاشی،سماجی، سیاسی اور مذہبی حالت پوری طرح مجروح ہوگئی اور باقاعدہ یہ اعلان بیانگ دہل کیا جاتا تھا:

’’خلقت خدا کی،ملک بادشاہ کا،حکم سرکار کمپنی بہادر کا‘‘ مطلب یہ کہ فرنگیوں کااثر ورسوخ ملک میں اس حدتک اثر انداز ہوگیا کہ ان کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے،ادھر مسلم حکمرانوں نے ملک کے ڈھانچے کونہایت مستحکم اورقوی بنایا تھا۔ یکا یک انگریزوں نے ملک کی پوری صورت حال اوراس کی خوشحالی کو بدل ڈالا۔اس وقت ملک کی جوسماجی،معاشی،سیاسی اوردینی حالت تھی اس کا تجزیہ سرسید نے اپنی کتاب’’اسباب بغاوت ہند‘‘اورمولانا محمد میاں نے اپنی کتاب’’علماء ہند کا شاندار ماضی‘‘ وغیرہ میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔گویا ملک پوری طرح افراتفری اوراتھل پتھل کا شکار ہوگیااور ملک کی تمام قدریں زوال کا شکار ہوگئیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کا زمانہ اس زوال پذیر دور کا نقطۂ عروج ہے۔

سماجی اقدار پر حملہ:

جب ہندوستان میں انگریزوں کے ذریعہ یہاں کی عوام کی بے توقیری اور ناقدری کی جانے لگی تو سرسید کا دل مچل اٹھتا ہے چنانچہ وہ اپنی کتاب ’’اسباب بغاوت ہند‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ رعایا کو باعزت رکھنا اور ان کی تالیف کرنا یعنی ان کے دلوں کو ہاتھ میں رکھنا بہت بڑا سبب ہے، پائیداری گورنمنٹ کا تھوڑا ملے اور آدمی کی عزت ہو تو وہ زیادہ خوش رہتا ہے بہ نسبت اس کے کہ بہت ملے اور تھوڑی عزت ہو، بے عزتی کرنی کسی کی ایسی بد چیز ہے کہ آدمی کے دل کو دکھاتی ہے یہی چیز ہے کہ بغیر ظاہری نقصان پہنچائے عداوت کرتی ہے اور اس کا ایسا گہرا زخم ہوتا ہے کہ کبھی نہیں بھرتا، **جراحات لسان لہاالتیام ولایلتام ماجرح اللسان** ۔تالیف کی خاصیت اس کے برخلاف ہے، یہ وہ چیز ہے کہ اس لیے دشمن دوست ہوتا ہے اور دوستوں کی محبت زیادہ ہوتی ہے۔ بیگانہ بیگانہ ہوتا ہے۔ یہی چیز ہے جس سے وحشی جنگل کے جانور، چرند و پرند تابع دار ہوتے ہیں، پھر اگر رعایا کے ساتھ ہو تو وہ کس قدر مطیع اور فرماں بردار ہوں گے، ابتدائے عملداری میں یہ چیز تھی کہ جس نے سب کے دلوں کو ہماری گورنمنٹ کی طرف کھینچ لیا تھا، ایک دلی اطاعت پیدا کر دی تھی، بیشک ہماری گورنمنٹ ان باتوں کو بھول گئی۔ بلاشبہ ہندوستان کی تمام رعایا نے اس

بات کی نشاندہی کی ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ان کو نہایت
بے قدر اور بے وقر کر دیا ہے۔ ہندوستان کے اشراف آدمی
کی ایک چھوٹے سے یورپین کے سامنے ایسی بھی قدر نہیں
ہے جیسی کہ ایک چھوٹے یورپین کی ایک بہت بڑے ڈیوک
کے سامنے ہوتی ہے۔ یوں تصور کیا جاتا تھا کہ ہندوستان
میں کوئی جنٹل مین نہیں ہے۔''(۱)

اس کے علاوہ انگریز حکومت کی طرف سے جو تعصب اور نا اتفاقی برتی جاتی تھی، اس کا نقشہ شیخ اکرام نے اپنی کتاب ''موج کوثر'' میں ڈاکٹر سرولیم ہنٹر کی معروف کتاب ''اورانڈین مسلمانز'' کے حوالے سے اس طرح کھینچا ہے:

''جب ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان سب قوموں سے
بہتر تھے، نہ صرف وہ دوسروں سے زیادہ بہادر اور جسمانی
حیثیت سے زیادہ توانا اور مضبوط تھے بلکہ سیاسی اور انتظامی
قابلیت کا ملکہ بھی ان میں زیادہ تھا، لیکن یہی مسلمان آج
سرکاری ملازمتوں اور غیر سرکاری اسامیوں سے یکسر محروم
ہیں۔''(۲)

اس مصنف کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ کیجئے:

سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کا مقابلہ دوسری قوموں کے ساتھ کرتے ہیں، پہلے مال اور منصفی کے محکموں میں مسلمانوں کی حالت زار بتائی، اس کے بعد لکھتے ہیں:

''لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی کا صحیح نقشہ ان محکموں میں دیکھا

---

(۱) سر، سید احمد خان، اسباب بغاوت ہند، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۰۳ء، ص:۱۴۔۴۲

(۲) شیخ، محمد اکرام، موج کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۲۰۰۳ء، ص:۷۶

جاسکتا ہے،جن میں ملازمتوں کی تقسیم پر لوگوں کی اتنی نظر نہیں ہوتی،۱۸۶۹ء میں ان محکموں کا حال تھا کہ اسسٹنٹ انجینئروں کے تین درجوں میں چودہ ہندو اور مسلمان صفر، اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ میں پچاس ہندو اور مسلمان معدوم وغیرہ۔ سرکاری ملازمتوں کے علاوہ ہائی کورٹ کے وکیلوں کی فہرست بڑی عبرت آموز تھی،ایک زمانہ تھا کہ یہ پیشہ بالکل مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا،اس کے بعد بھی ۱۸۵۱ء تک مسلمانوں کی حالت اچھی رہی اور مسلمان وکلاء کی تعداد ہندوؤں اور انگریزوں کی مجموعی تعداد سے کم نہ تھی،لیکن ۱۸۵۱ء سے تبدیلی شروع ہوئی، اب نئی طرز کے آدمی آنے شروع ہوئے اور امتحانات کا طریقہ بھی بدل گیا۔۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۸ء تک جن ہندوستانیوں کو وکالت کے لائسنس ملے۔ان میں ۲۳۹ ہندو تھے اور ایک مسلمان، ڈاکٹر ہنٹر نے مزید لکھا ہے کہ اگلے دن ایک بڑے سرکاری محکمے میں دیکھا گیا کہ سارے ڈپارٹمنٹ میں ایک بھی اہلکار ایسا نہ تھا جو مسلمانی زبان سے واقف ہو اور حقیقتاً اب کلکتہ میں شاید ہی کوئی سرکاری دفتر ایسا ہوگا جس میں کسی مسلمان کو دربانی، چپراسی یا دوائیں بھرنے،قلم دوست کرنے کی نوکری سے زیادہ کچھ ملنے کی امید ہو سکتی ہو۔تمام ملازمتیں اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ، آہستہ آہستہ مسلمانوں سے چھینی جارہی ہیں اور دوسری قوموں یا مخصوص ہندوؤں کو بخشی جاتی ہیں۔حکومت کا فرض ہے کہ رعیت کے تمام طبقوں کو ایک نظر سے دیکھتے لیکن اب یہ

حالت ہے کہ حکومت سرکاری گزٹ میں مسلمانوں کو سرکاری
ملازمتوں سے علیحدہ رکھنے کا کھلم کھلا اعلان کرتی ہے۔‘‘(۱)

درج بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سماجی قدروں اوراس کے بنیادی فریضہ کو کس قدر پامال کیا جارہا تھا، عدل وانصاف اور مساوات وبرابری نام کی کوئی چیز نہیں تھی، ایک طرف مسلمانوں اور ہندوستانی عوام کی عزت وتوقیر کو پامال کیا جارہا تھا تو دوسری طرف ان کے ساتھ تمام سرکاری شعبوں اور محکموں میں ناانصافی کی جارہی تھی، جو یقیناً سماجی اعتبار سے نہایت خطرناک کھیل تھا۔

معاشی واقتصادی اقدار پر حملہ:

جس طرح ملک میں بدعنوانی اور سماجی عدل وانصاف کو پوری طرح ختم کردیا گیا تھا اسی طرح ملک کی معاشی حالت بھی بالکل قابل رحم ہوگئی تھی، اس بابت مؤرخین اور ماہرین نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔

چنانچہ مولانا محمد میاں اپنی کتاب ’’علماء ہند کا شاندار ماضی‘‘ میں تحریر کرتے ہیں:

’’پس حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کا یہ خونی حادثہ مٹی ہوئی جاگیر شاہی کی انگڑائی نہیں بلکہ ایک قوم کی بڑھتی ہوئی جاگیر شاہی کے مقابلہ میں دوسری قوم کی حرکت مذبوحانہ تھی، یہ بحث طویل ہے، اس کا ہر ایک گوشہ ایک داستان رکھتا ہے، تنخواہوں کا تفاوت، مالگذاری کا اضافہ، وصول مالگذاری کے لیے جانداروں کا نیلام، نیلام کے دل آزار اور توہین آمیز طریقے، سود اور سود درسود کا رواج وغیرہ غرض ہر ایک باب داستان الم ہے۔‘‘(۲)

(۱) ایضاً ص:۷۵-۷۶

(۲) سید محمد میاں، علماء ہند کا شاندار ماضی، الجمعیۃ پریس، ۱۹۶۰ء، ج:۴، ص:۲۴

مولانا محمد میاں نے اپنی مذکورہ کتاب میں ایک خط ولیم ایڈوارڈس کا نقل کیا ہے جو اس وقت ضلع بدایوں کے مجسٹریٹ تھے، اس سے اندازہ ہوگا کہ ہندوستان کی معاشی صورت حال کس حد تک بدتر ہوگئی تھی:

''ضلع میں ایسے بہت لوگ میرے دوست تھے جو مجھ کو پناہ دے سکتے تھے بلکہ یہ لوگ خود اس کے آرزومند تھے، لیکن میرے ساتھ میرے بہت سے ساتھیوں کو بھی پناہ دے کر اپنے امن کو تذبذب میں ڈال دینا، کسی طرح پسند نہیں کرتے، خصوصاً اس سبب سے کہ ان میں بعض لوگوں نے ایسی زمینداریاں مول لی تھیں جو ہماری دیوانی عدالتوں کی ڈگریوں میں سختی کے ساتھ نیلام ہوئی تھیں اور اسی لیے ضلع کے لوگ ان سے عداوت رکھتے تھے، پچھلے بارہ پندرہ برسوں میں ایسے نیلام بڑی کثرت سے ہوئے اور تحصیل مالگذاری کے ایسے طریقے جاری ہوئے کہ ملک کے رئیس لوگ برباد ہوگئے اور دیہات کے جتھے ٹوٹ گئے۔ اکثر ذی مرتبہ اور مقتدر خانوادوں کے علاقے فریب یا دغابازی سے چھن گئے اور اجنبی لوگوں مثلاً مہاجنوں یا سرکاری ملازموں نے جن کا پاس ولحاظ یا دباؤ رعایا پر مطلق نہیں تھا، خرید لئے۔ یہ لوگ خود بھی اپنے خریدے ہوئے علاقوں سے علی الاکثر غیر حاضر رہا کرتے ہیں، یا تو وہاں رہنے سے ڈرتے ہیں یا وہاں کا رہنا ان کو خوش نہیں آتا کیونکہ ان کو وہاں کے لوگ غاصب اور دخیل بے جا کی طرح دیکھتے ہیں۔ پھر ان چھنے ہوئے

علاقوں کے مالکان قدیم اس آراضی پر جو پہلے کبھی ان کی اپنی
تھی کاشتکارانہ قابض ہیں اور اپنی حالت کا انقلاب ان کو
نہایت رنج دہ ہوتا ہے۔ گو قبضہ مالکان آراضی ان کے ہاتھ
سے نکل گیا، لیکن رعایا کی محبت اور ہمدردی پر ویسا ہی مستقل
موروثی قبضہ رکھتے ہیں جیسا ہمیشہ سے چلا آتا ہے اور رعیت
بھی آمادہ و متمنی ہے کہ جب کبھی ان کے کھیا، کھویا ہوا درجہ یا
اپنے علاقوں پر قبضہ حاصل کرنے کا ارادہ کریں ان کا ساتھ
دے۔''(۱)

مولانا محمد میاں نے سرسید کا رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' کے حوالے سے لکھا ہے:

''ہندوستان کی رعایا روز بروز مفلس ہوتی جاتی تھی، ٹیکس کی
زیادتی نے زمینداروں اور کاشتکاروں کو تباہ کر دیا تھا، وصول
کر کے زمینداریاں نیلام کی جاتی تھیں، جو ہندوستان میں
بالکل نیا دستور تھا۔ ولایتی مال کی آمد نے اہل حرفہ کو برباد
کر دیا تھا باایں ہمہ حکومت نے ایسے نوٹ جاری کر دیئے جس
پر ملک سے سود وصول کیا جاتا تھا، اگلی عملداریوں میں شاہی
انعام واکرام آسودگی رعایا کا ایک مستقل ذریعہ تھا، جب
شاہجہاں تخت پر بیٹھا تو صرف تخت نشینی کے دن چار لاکھ بیگھہ
زمین اور ایک سو بیس گاؤں اور لاکھوں روپے انعام دیئے
تھے، یہ بات ہماری گورنمنٹ میں یک قلم مسدود تھی بلکہ پہلی
بھی ضبط ہو گئیں تھیں، اس عام افلاس کا نتیجہ تھا کہ جب

(۱) ایضاً، ص: ۱۳۔۱۴

باغیوں نے لوگوں کونوکر رکھنا چاہا تو جیسے بھوکا آدمی قحط کے
دنوں میں اناج پر گرتا ہے اسی طرح یہ لوگ نوکریوں پر جا
گرے۔ بہت سے آدمی صرف آنہ یومیہ پرنوکر ہوئے تھے
اور بہت سے آدمی سیر ڈیڑھ سیر جَو اناج پاتے تھے۔''(۱)

سرسید کے حوالے سے مولانا محمد میاں نے مزید لکھا ہے:

''غرض کہ ملک ہرطرح سے مفلس ہوگیا تھا، اگلے خاندان
جن کو ہزاروں کا مقدور تھا،معاش سے بھی تنگ آ گئے تھے
اور یہ اصلی سبب ناراضگی رعایا کا گورنمنٹ سے تھا،لوگوں کے
دل جوتبدیلی عملداری کو چاہتے تھے اورنئ عملداری کے لیے
راغب اوردل سے خوش تھے۔میں سچ کہتا ہوں کہ اس سبب
سے تھے،ہم سچ کہتے ہیں اور پھر ہم سچ کہتے ہیں،ہم بہت سچ
کہتے ہیں کہ جب افغانستان سرکار نے فتح کیا تو لوگوں کو بڑا
غم ہوا کیا سبب تھا؟ صرف یہ سبب تھا کہ اب مذہب پرعلانیہ
دست اندازی ہوگی، جب گوالیار فتح ہوا، پنجاب فتح ہوا،اودھ
لیا گیا تو لوگوں کوکمال رنج ہوا کیوں ہوا؟ یہ اس لیے ہوا کہ ان
کے پاس کی ہندوستانی عملداریوں سے ہندوستان کو بہت
آسودگی تھی،نوکریاں اکثر ہاتھ آتی تھیں، ہرقسم کی ہندوستانی
اشیاء کی تجارت بکثرت تھی،ان عملداریوں کے خراب ہونے
سے زیادہ افلاس اورمحتاجی ہوتی جاتی تھی۔''(۲)

مذکورہ تمام شواہد اور دلائل اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ انگریزوں نے

(۱) ایضاً،ص:۲۸،بحوالہ اسباب بغاوت ہند،ص:۳۵۔۳۶
(۲) ایضاً،ص:۲۹۔بحوالہ اسباب بغاوت ہند،ص:۳۶۔۳۷

صرف مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ پورے ملک کی حالت خرد برد کر دی تھی، پورے ملک کی معیشت چرمراگئی تھی، جبکہ یہ ایک ناقابل تردید صداقت ہے کہ کسی بھی معاشرے کو زندہ رکھنے اور اس کی فکری و عملی اور تحقیقی توانائی کو جلا بخشنے کے لیے، اقتصادیات اور معاشیات کو پوری طرح محفوظ و مامون بنانا ہوتا ہے، مگر انگریزوں کے ہاتھ میں ملک چلے جانے کے بعد ملک کی معیشت جس طرح تباہ اور بدتر ہوئی وہ افسوسناک بات تھی، شیخ اکرام نے اپنی کتاب ''موج کوثر'' میں لکھا ہے:

> ''ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب کے چوتھے باب میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت کا نقشہ کھینچا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو حکومت سے بہت سی شکایات ہیں، ایک شکایت یہ ہے کہ حکومت نے ان کے لیے تمام اہم عہدوں کا دروازہ بند کر دیا ہے، دوسرے ایک ایسا طریقۂ تعلیم جاری کیا ہے جس میں ان کی قوم کے لیے کوئی انتظام نہیں، تیسرے قاضیوں کی موقوفی نے ہزاروں خاندانوں کو جو فقہ اور اسلامی علوم کے پاسبان تھے بیکار اور محتاج کر دیا ہے، چوتھی شکایت یہ ہے کہ ان کے اوقاف کی آمدنی جو ان کی تعلیم پر خرچ ہونی چاہئے تھی، غلط مصرفوں پر خرچ ہو رہی ہے۔''(۱)

گویا کہ مسلمانوں کو پوری طرح معاشی اور اقتصادی طور پر مفلوج بنا دیا گیا تھا۔

مذہبی و تہذیبی اقدار پر حملہ:

یہاں یہ حقیقت بتانا بھی ضروری ہے کہ انگریزوں نے صرف ملک کی

---

(۱) موج کوثر، ص: ۴۷

معیشت اور سماجی رویوں کی پاکیز گی پر ہی حملہ نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے مذہب ودین اور تہذیبی وتمدنی تشخص کو بھی بری طرح مجروح کرڈالا تھا۔ یقیناً یہ ان کا بڑا سنگین جرم تھا، اس حوالہ سے سرسید نے ان کی کافی گرفت کی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' میں لکھتے ہیں:

''ہر شخص دل سے جانتا ہے کہ ہماری گورنمنٹ کے احکام بہت آہستہ آہستہ ظہور میں آتے ہیں اور جو کام کرنا ہوتا ہے رفتہ رفتہ کیا کرتے ہیں، اس واسطے دفعتاً اور جبراً دین بدلنے کو نہیں کہتے، مگر جتنا جتنا قابو پاتے جائیں گے اتنی اتنی مداخلت کرتے جائیں گے اور جو باتیں رفتہ رفتہ ظہور میں آتی گئیں ان کے اس غلط شبہ کو زیادہ تر مستحکم اور مضبوط کرتی گئیں۔ سب کو یقین تھا کہ ہماری گورنمنٹ علانیہ جبراً مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کرے گی بلکہ خفیہ تدبیریں کرکے مثل نابود کردینے، علم عربی وسنسکرت کے اور مفلس محتاج کردینے ملک کے اور لوگوں کو جوان کا مذہب ہے، اس کے مسائل سے ناواقف کرکے اور اپنے دین ومذہب کی کتابیں اور مسائل اور وعظ کو پھیلا کر نوکریوں کا لالچ دے کر لوگوں کو بے دین کردیں گے۔ ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کئے گئے وہ تمام اضلاع ممالک مغربی وشمالی میں ادارہ گورنمنٹ کے ایک نمونہ گنے جاتے کہ ہندوستان کو اس طرح پر مفلس اور محتاج کرکے اپنے مذہب میں لے آئیں گے، میں سچ کہتا ہوں کہ جب سرکار انریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کوئی ملک فتح

کرتی تھی تو ہندوستان کی رعایا کو کمال رنج ہوتا تھا اور یہ بھی میں سچ کہتا ہوں کہ منشا اس رنج کا اور کچھ نہیں ہوتا تھا بجز اس کے کہ لوگ جانتے تھے کہ جوں جوں اختیار ہماری گورنمنٹ کا زیادہ ہوتا جائے گا اور کسی دشمن اور ہمسایہ حاکم کے مقابلہ اور فساد کا اندیشہ بڑھے گا دوں دوں ہمارے مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کریں گے۔''(۱)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''پادری صاحبوں کے وعظ نے نئی صورت نکالی تھی ،تکرار مذہب کی کتابیں بطور سوال وجواب چھپنی اور تقسیم ہونی شروع ہوئیں ان کتابوں میں دوسرے مذہب کے مقدس لوگوں کی نسبت الفاظ اور مضامین رنج دہ مندرج ہوئے، ہندوستان میں وعظ اور کتھا کا دستور یہ ہے کہ اپنے اپنے معبود یا مکان پر بیٹھ کر کہتے ہیں کہ جس کا دل چاہے اور جس کو رغبت ہو وہاں جا کر سنے، پادری صاحبوں کا طریقہ اس کے برخلاف تھا وہ خود غیر مذہب کے مجمع اور تیرتھ اور میلہ میں جا کر وعظ کہتے تھے اور کوئی شخص صرف حکام کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا، بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا کہ پادری صاحب کے ساتھ تھانہ کا ایک چپراسی جانے لگا، پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں کو اور مقدس مقاموں کو بہت

(۱) سرسید احمد خان، اسباب بغاوت ہند، مفید عام آگرہ، ۱۹۰۳ء، ص: ۱۶۔۱۷

برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی اور ہماری گورنمنٹ سے ناراضگی کے بیج لوگوں کے دلوں میں بویا جاتا تھا۔''(۱)

اس طرح سر سید نے یہ بھی لکھا ہے:

''مشنری اسکول بہت جاری ہوئے اوران میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی۔ سب لوگ کہتے تھے کہ سرکار کی طرف سے ہیں، بعض اضلاع میں بہت بڑے بڑے عالی قدر حکام متعہد ان اسکولوں میں جاتے تھے اور لوگوں کو اس میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے، امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا تھا اور طالب علموں سے جولڑکے کم عمر ہوتے تھے، پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون ہے؟ تمہارا نجات دینے والا کون ہے؟ اور وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے اس پر ان کو انعام ملتا تھا ان سب باتوں پر رعایا کا دل ہماری گورنمنٹ سے پھرتا جاتا تھا۔''(۲)

اسی طرح اور دیگر امور انجام دیئے جاتے تھے جن کی وجہ سے ملک میں بڑی تیزی سے مسلمانوں یا دیگر قوموں کا دھرم تبدیل کروایا جارہا تھا، سر سید نتیجہ کے طور پر لکھتے ہیں:

''ان سب باتوں سے مسلمان بہ نسبت ہنود کے بہت زیادہ ناراض تھے اس کا سبب یہ ہے کہ ہندو اپنے مذہب کے احکام بطور رسم ورواج کے ادا کرتے ہیں نہ بطور احکام مذہب کے،

---

(۱) ایضاً ص:۱۸

(۲) ایضاً ص:۱۸

احکام اور عقائد اوروہ دلی اعتقادی باتیں جن پرنجات عاقبت کی موافق ان کے مذہب کے منحصر ہے مطلق معلوم نہیں ہیں اور نہ ان کے برتاؤ میں ہیں اس سبب سے وہ اپنے مذہب میں نہایت سست اور بجز ان رسمی باتوں کے اور کھانے پینے کے پرہیز کے اور کسی مذہبی عقیدے میں پختہ اور متعصب نہیں ان کے سامنے ان کے اس عقیدے کے جس کا دل میں اعتقاد چاہیئے برخلاف باتیں ہوا کریں، ان کو کچھ غصہ یا رنج نہیں آتا برخلاف مسلمانوں کے وہ اپنے مذہب کے عقائد بموجب جو باتیں کہ ان کے مذہب میں نجات دینے والی اور عذاب میں ڈالنے والی ہیں بخوبی جانتے ہیں اور ان احکام کو مذہبی احکام اور خدا کی طرف کے احکام سمجھ کر کرتے ہیں اس سبب سے اپنے مذہب میں پختہ ہیں''۔ (۱)

علاوہ ازیں مولانا محمد میاں نے اپنی کتاب ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' میں شمس العلماء ذکاء اللہ خاں کی کتاب ''تاریخ عروج عہد انگلشیہ'' کے حوالہ سے لکھا ہے:

''مشنریوں اور انگریزی حکام کی ان کوششوں کو جو ہندوؤں کے مذہب اور ان کے رسم ورواج کے خلاف تھیں اس کی مخالفت پنڈت بھی کرتے تھے۔ پنڈتوں نے اپنی مذہبی کتابوں میں دنیاوی علوم کی ہر شاخ کو باقاعدہ نظام کے ساتھ داخل کر رکھا ہے غرض اس دنیا میں اور اس سے باہر ہندوؤں پر

(۱) ایضاً، ص:۲۳

اقتدار پنڈتوں کو وہ حاصل ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں۔اب انگریزی عملداری میں ان کے سارے اقتدار اور اختیاروں میں خلل پڑا،مقدمات میں رجوع انگریزی عدالتوں میں کیا جاتا اوران کی اپیل بھی اعلیٰ عدالتوں میں ہوتی، پنڈتوں کی پوچھ گچھ ان میں کمتر ہوگئی، اس لیے یہ سارا فرقہ انگریزی عملداری کا بدخواہ ہوگیا۔''(۱)

سطور بالا کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہیں کہ انگریزوں یا فرنگیوں نے صرف ملک پر قبضہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ وہ یہاں کی عوام کا مذہب تبدیل کرنے کی بھی پوری کوشش کرتے تھے،اس کی وجہ سے ہندوؤں خصوصاً مسلمانوں میں ان کے خلاف حوصلہ پنپا،اسی طرح انہوں نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور یہاں کے باہمی اقدار کو بھی روندنا شروع کیا تھا،چنانچہ سرسید اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' میں درج کرتے ہیں:

''حال کے حکام متعہد سے وہ پہلے لوگ بہت عزت کرتے تھے، ہندوستانیوں کی ہرطرح سے خاطرداری کرتے تھے،ان کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے،دوستانہ ان کے رنج و راحت کے شریک ہوتے تھے باوجودیکہ وہ بہت بڑی سرداری اورحکومت ہندوستان میں رکھتے تھے اور حشم ورعب اور دبدبہ جوشایان حکومت ہے وہ بھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے، پھرایسی محبت اورعزت ہندوستانیوں کی کرتے تھے کہ ہرشخص مل کران کے اخلاق اوران کی محبت کا فریفتہ ہوجاتا تھا۔''(۲)

---

(۱) علماء ہند کا شاندار ماضی،ص:۴۳

(۲) ایضاً،ص:۴۲۔۴۳

مگر افسوس ہندوستان کی ان تمام خوبیوں ،تعمیری افکار کو مخدوش کر ڈالا گیا جس کی وجہ سے عوام میں انگریزوں کے خلاف بے چینی پیدا ہوئی اور یہاں کی عوام اور خواص کے دل میں ملک کی سالمیت کا احساس تیزی سے پیدا ہونے لگا۔ چنانچہ مولانا محمد میاں اپنی کتاب میں اس بے چینی کی ابتدا کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''اس بے چینی نے سب سے پہلے ۲۲ر جنوری ۱۸۵۷ء کو ڈم ڈم (کلکتہ) میں عملی شکل اختیار کی ، یہاں مقیم دیسی سپاہیوں نے اپنے انگریز افسر سے شکایت کی کہ این فیلڈ رائفلوں کے لیے جہاں کارتوس بنائے جاتے ہیں ان میں گائے اور سور کی چربی ہے، اس افسر نے حکومت ہند کو اس بات سے آگاہ کر دیا حکومت نے بعض چھاؤنیوں میں دیسی سپاہیوں کو یقین دلایا کہ کارتوس میں ممنوعات استعمال نہیں کی جا رہی ہے، لیکن یہ افواہ بارود کے ڈھیر میں چنگاری کا کام کر چکی تھی۔ پارک پور نے فوجیوں بہرام پور کی انیسویں رجمنٹ میں بے چینی کا بیج بو دیا۔ ۱۹ر فروری کی رات کو اس رجمنٹ نے مظاہرہ شروع کر دیا۔ کرنل ''مچل'' نے فوجیوں سے اس مظاہرہ کا سبب دریافت کیا، فوجیوں کا جواب تھا: ''سرکار ہمارا دین بگاڑ رہی ہے۔''(۱)

مولانا محمد میاں نے مزید لکھا ہے:

''یہ دین دین کا نعرہ لگانے والا ایک برہمن تھا ''منگل پانڈے''

---

(۱) علماء ہند کا شاندار ماضی،ص:۹۰۔۹۱

اس کا واقعہ یہ تھا کہ فوج کے ایک خلاصی نے جو نیچ ذات
کا تھا، اس سے کہا کہ اپنے لوٹے سے مجھے پانی پلا دے،
منگل پانڈے نے جواب دیا: ''تو کس ذات کا ہے، خلاصی
نے طنزاً کہا، ذات کیا پوچھتے ہو اب سب ذات پات رکھا رہ
جائے گا، وہ کارتوس آ گئے ہیں جن میں سور اور گائے کی چربی
لگی ہے۔ان کو دانت سے کاٹنا پڑے گا۔''(۱)

اس واقعہ کی پوری تفصیل مولانا محمد میاں نے اپنی کتاب ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' میں لکھی ہے، تفصیل طوالت کے باعث چھوڑی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے ان تمام حالات سے ملک کے اندر بے چینی اور ہندوستانی معاشرہ میں بددلی پیدا ہونا فطری بات تھی، مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور ہندوؤں کی رسم ورواج کو پوری طرح پامال کیا جانے لگا اور ملک میں پوری طرح انگریزی حکومت قابض ہوگئی تو پھر ہمارے علماء اور مذہبی رہنماؤں نے جہاد کا فتویٰ دیا۔اس فتویٰ کی بابت مولانا محمد میاں نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔مفتی اعظم شاہ عبدالعزیز نے لکھا ہے:

''اس اطراف میں اور یہاں سے لے کر کلکتہ تک نصاریٰ
کا حکم جاری ہے، وہ بلا روک ٹوک جو کچھ چاہتے ہیں کرتے
ہیں، عبادت گاہیں تک مسمار کر ڈالتے ہیں، مذہب کا کوئی
احترام ان کی نظر میں نہیں ہے۔''(۲)

اسی طرح کی کاوشوں نے ہندوستانیوں کے دلوں میں یہ بات راسخ کر دی تھی کہ ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانا ہے۔ چنانچہ مولانا محمد میاں لکھتے ہیں:

---

(۱) ایضاً، ص:۹۱
(۲) ایضاً، ص:۱۸۳

''ہم ہندوستانی ہیں، ہندوستان ہماراوطن ہے،سات سمندر پار سے انگریز سوداگری کی غرض سے ہندوستان آئے، حکومت ہند نے ان کوتجارت کی اجازت دی،ان غیرملکیوں نے غیرملکی رہتے ہوئے رفتہ رفتہ ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ یہ قبضہ بالجبر اور یہ تسلط غاصبانہ ہے۔باشندگان وطن کا فرض ہے کہ اس بیرونی طاقت سے وطن کوآزاد کرائیں۔''(۱)

بالائی سطروں میں مذکورہ پس منظر سے یہ بات سامنے آگئی کہ جب ہندوستان میں مسلمان آئے تو انہوں نے ہر اعتبار سے ملک کی عظمت وسلامتی اور تعمیر وترقی کے لیے جدوجہد کی اور وطن عزیز کو معاشی، اقتصادی اور دیگر تمام میدانوں اور شعبوں میں قابل ذکر بنایا،مگر بدقسمتی سے جب ہندوستان جیسے عظیم ملک پرفرنگیوں کا قبضہ ہوگیا تو انہوں نے نہ صرف ملک کومعاشی اوراقتصادی طور پرکمزور کیا بلکہ یہاں کی عوام کے مذہبی جذبات کوٹھیس تک پہنچائی۔اسی طرح ملک میں نہ اسلامی قدریں اورنہ ہندوانہ رسوم ورواج محفوظ تھے جواب سے پہلے یہاں کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔اس کے ساتھ یہ بات بھی گوش گزار کردوں کہ انگریزوں کے مظالم اوران کی زیادتی ،مذہبی معاملات میں مداخلت اورخرد برد سے دل برداشتہ ہوکر ملک کوآزاد کرانے کی خاطر سب سے پہلے فتویٰ ایک مسلمان عالم کی طرف سے آیا، یہی نہیں بلکہ اس فتویٰ جہاد پرمہرثبت اس وقت کے بڑے بڑے اصحاب علم وفضل اورعلماء نے کی تھی،اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے وطن سے محبت اوروفاداری کی غرض سے جہاد کا فتویٰ دیا تھا، ہندوستان جواب تک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا وہ اب پوری طرح انگریزوں کے تسلط میں

(۱) ایضاً،ص:۱۹۵

چلا گیا، انہوں نے تمام طرح کی زیادتیاں کیں، اسی دوران یہ بحث بھی اٹھی کہ آیا اس وقت ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ چنانچہ اس وقت کے علماء نے جوفتاوے دیئے تھے اور ملک کی شرعی حیثیت بیان کی تھی اس کو ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

آزادی سے قبل ہندوستان کی شرعی حیثیت:

جب ہندوستان کو غلام بنالیا گیا اور ملک پر پوری طرح انگریزوں کی حکومت ہوگئی، اس دوران ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق مفتیان نے جو آراء پیش کی ہیں ذیل میں ان کو پیش کیا جائے گا۔ ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق کافی کچھ لکھا جاچکا ہے اور مختلف کتب فتاویٰ میں باقاعدہ فتاویٰ بھی موجود ہیں، البتہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے ایک کتاب تحریر کی ہے "نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت" اس کتاب میں مولانا نے ان تمام فتاویٰ جات کو جمع کردیا ہے جو آزادی سے قبل یا آزادی کے بعد دیئے گئے تھے، پھر مزید یہ کہ مولانا نے ان فتاویٰ جات پر نقد وتبصرہ بھی کیا ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ (۱۱۰۹ھ تا ۱۲۳۹ھ):

شاہ عبدالعزیزؒ نے ہندوستان کے متعلق جوفتویٰ دیا ہے اس کا ذکر بھی مذکورہ کتاب میں موجود ہے:

> "اس شہر (دہلی) میں مسلمانوں کے امام کا حکم بالکل جاری نہیں ہے، بلکہ نصاریٰ کے سرداروں اور افسروں کا حکم بے دغدغہ جاری ہے، ہاں اگر بعض اسلامی احکام مثلاً جمعہ اور اذان اور گاؤکشی وغیرہ سے تعرض نہیں کرتے ہیں تو پڑے نہ کریں مگر ان احکام اصل الاصول ان کے نزدیک بالکل ہیچ اور ضائع ہیں

کیونکہ مسجدوں جو خانۂ خدا ہیں، بے تکلف مسمار اور خراب کرا دیتے ہیں، اگر کوئی مسلم یا ذمی (غیر مسلم) انگریزوں سے پناہ لیے بغیر دلی یا اس کے گردونواح میں داخل ہو جائے تو ممکن نہیں ہے، شجاع تک اور ولایتی بیگم بھی ان لوگوں کی اجازت کے بغیر اس شہر میں نہیں آسکتے، غرض جب حدیثوں اور صحابۂ کرام اور خلفاء عظام کی سیرت پر متجسس نگاہیں ڈالی جاتی ہیں تو سمجھ میں یہی آتا ہے کہ یہ شہر دارالحرب ہے۔"(۱)

مولانا کے اس فتویٰ سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ہندوستان دار الحرب کے زمرے میں ہے۔ البتہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے اس فتویٰ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"علاوہ ازیں ایک شخص نے دارالحرب میں سودی لین دین کے بارے میں سوال کیا تو حضرت شاہ صاحب نے اس کے جواب میں دارالحرب اور دارالاسلام کی بحث چھیڑ دی ہے اور اس سلسلہ میں مختلف آراء و اقوال نقل کرنے اور اپنی رائے کے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اور جب یہ ہے تو انگریزوں اور ان جیسے کافروں کے مقبوضات بلاشبہ دارالحرب ہیں۔"(۲)

سید احمد شہید بریلویؒ (۱۷۸۶-۱۸۳۱ء):

یہ ایک حقیقت ہے کہ سید احمد شہید نے ملک کی آزادی کی خاطر خاصی قربانیاں دی ہیں، انہوں نے ریاست گوالیار کے مدارالمہام راجہ ہندوراؤ کو جو

---

(۱) اکبرآبادی، سعید احمد، (مولانا) نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ص:۳۸
(۲) ایضاً، ص:۳۸

مکتوب گرامی لکھا ہے، اس میں فرماتے ہیں:

''جناب پر یہ بات روشن اور ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ سمندر پار سے یہاں آ کر بادشاہ زمین وزماں ہو گئے اور جو سوداگر تھے وہ سلطنت کے مرتبہ کو پہنچ گئے ہیں، ان لوگوں نے بڑی بڑی امارتیں اور ریاستیں برباد کردی ہیں اور ان کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دیا ہے (ان کے حالات کے باوجود) چونکہ ارباب ریاست وسیاست گوشۂ گمنامی و بے عملی میں پڑے ہوئے ہیں اس لیے ہم چند فقیر واہل مسکنت دین رب العالمین کی خدمت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔''(۱)

مولانا عبدالحیؒ لکھنویؒ (۱۸۴۸-۱۸۸۶ء):

مولانا عبدالحیٔ لکھنوی سے جب ہندوستان کی شرعی حیثیت سے متعلق فتویٰ دریافت کیا گیا تو انہوں نے درج ذیل جواب دیا:

''جہاں تک عملداری انگریزوں کی ہے، ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو صرف صاحبین کے مذہب کے مطابق یا ابوحنیفہؒ کے مذہب کے موافق بھی؟ اس استفتاء کا جواب مولانا نے دیا کہ ہندوستان دارالحرب نہیں ہے، بلکہ دارالاسلام ہے، اس کے بعد اس دعویٰ کے ثبوت میں کتب فقہ سے طویل عبارتیں نقل کیں ہے، اس کے آخر میں لکھتے ہیں:

''ان عبارات سے اوران کی امثال سے واضح ہے کہ دار الاسلام کے دارالحرب ہونے میں شرط یہ ہے کہ احکام کفر علانیہ

---

(۱) ایضاً ص:۳۹۔۴۰

جاری ہوں اوراحکام اسلام بالکلیہ موقوف کردیئے جائیں اورشعائر اسلام اور ضروریات دین میں کفار مداخلت کرنے لگیں اور یہ شرط اتفاقی (متفق علیہ) ہے اورامام ابوحنیفہؒ نے اس کے سوااوربھی دوشرطیں زائد کی ہیں،ایک یہ کہ اس بلدہ میں اوردارالحرب میں کوئی بلدہ مملکت اہل اسلام کا باقی نہ رہے،دوسرے یہ کہ امان اول اٹھ جائے اور بامان کفار اقامت کی نوبت آئی ہواورظاہر ہے کہ بلاد ہندوستان میں یہ مفقود ہے،اس لیے شعائراسلام میں ہنوز حکام کی طرف سے مداخلت اورممانعت نہیں ہے ۔اگرچہ اکثر قضاۃ کفار ہیں اورخلاف اسلام احکام جاری کرتے ہیں مگر بہت سے امور میں مذہب اسلام اورشرع کے موافق بھی فیصلہ کرتے ہیں۔ ہندوستان امام ابوحنیفہؒ اورصاحبین رحمہم اللہ کسی کے نزدیک دارالحرب نہیں ہے۔"(۱)

مولانا انور شاہ صاحبؒ (۱۸۷۵-۱۹۳۳ء):

دریں اثنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب فقہاء احناف کے دیگر علماء کی آراء بھی بیان کردی جائیں چنانچہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے متعلق مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے لکھا ہے:

"حضرت مولانا انورشاہ کشمیریؒ نے پشاور کی جمعیۃ علماء ہند کی عظیم الشان سالانہ کانفرنس میں بحثیت صدر ایک خطبہ فارسی زبان میں پیش کیا تھا جس میں انہوں نے ہندوستان کو دار

---

(۱) فرنگی،عبدالحئی،(مولانا) مجموعہ فتاویٰ، یوسفی پریس فرنگی محل لکھنؤ،۱۳۱۲ھ، ج:۱،ص:۳۷-۳۴

الامن قرار دیا تھا البتہ دارالامن سے حضرت شاہ صاحب کی مراد ''دارالعہد ہے۔''

چنانچہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی مولانا انور شاہ صاحب کی اس رائے کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ہمیں معلوم ہوا کہ شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی ہندوستانیوں کو انگریز کے ہاتھوں میں قیدی سمجھتے تھے اور کسی معاہدہ کے قائل نہیں تھے، لیکن میرے نزدیک محقق بات یہ کہ اگرچہ حکومت اور اہل ہند کے درمیان باقاعدہ کوئی معاہدہ نہیں ہے، لیکن عملاً معاہدہ ہے چنانچہ ہم اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے ہیں اور جانی و مالی امور میں ان سے مدد طلب کرتے ہیں اور ان تمام معاملات میں ہم ان کی طرف رجوع کرتے ہیں، جن میں فریقین معاہدہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اگرچہ اس بات کو کسی فقیہ نے نہیں لکھا مگر میرے نزدیک حکم یہ ہی ہے اور اس پر ہی تمام تفریعات ہوں گی اس کے بعد فرماتے ہیں یہ معاہدہ پہلے جان اور مال دونوں کے متعلق تھا، لیکن اب جان سے متعلق معاہدہ کو ہم نے ان کے منہ پر دے مارا ہے (یعنی وہ ہماری جان کے ذمہ دار نہیں اور ہم ان کی جان کے نہیں) البتہ اموال کے بارے میں معاہدہ اب تک باقی ہے۔''(۱)

(۱) نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت، ص:۴۸

حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ (۱۸۸۰-۱۸۳۳ء):

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مولانا قاسم نانوتوی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ''ہندوستان میں سودی لین دین'' کے متعلق مختلف اور متعدد روایات نقل فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:

باعتبار روایات منقولہ ہندوستان دارالاسلام ہست۔

ان روایات کے پیش نظر ہندوستان دارالاسلام ہے، اس کے بعد رسالہ کے آخر میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے دارالحرب ہونے میں کلام ہے جیسا کہ گذشتہ روایات منقولہ سے تم کو معلوم ہوا ہوگا اگرچہ اس ہیچدان کے نزدیک راجح یہی ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔''

اس کے بعد مولانا نانوتوی ان پر طنز کرتے ہیں جو ملک کو دارالحرب قرار دے کر سودی لین دین کو جائز قرار دیتے ہیں:

''یہ بڑے عجیب وغریب قسم کے لوگ ہیں، جب ہم کہتے ہیں کہ اچھا اگر ہندوستان دارالحرب ہے تو تمھیں ہجرت کرنی چاہئے، اس پر وہ کہتے ہیں کہ یہ دارالاسلام ہے، مگر جب ہم کہتے ہیں کہ یہاں سودی کاروبار جائز نہیں تو جھوٹ بول اٹھتے ہیں کہ یہ تو دارالحرب ہے، گویا چت بھی ان کی اور پٹ بھی ان کی، ہجرت سے بچنے کے لیے اس کو دارالاسلام کہہ دیا اور سود کھانے کے لیے اسے دارالحرب قرار دے دیا، سبحان اللہ۔''(۱)

---

(۱) ایضاً، ص:۴۳-۴۴

مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۸۶۳-۱۹۴۳ء):

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے متعدد مقامات پر ہندوستان میں سود لینے کے متعلق لکھا ہے مگر انہوں نے ہندوستان کو دارالحرب کہیں نہ لکھا ہے بلکہ آپ کا یہ ارشاد عام طور پر مشہور ہے اگر کوئی شخص کسی وجہ سے ریل کا ٹکٹ نہیں خرید سکا اور اسی حالت میں اس نے سفر بخیر وخوبی طے کرلیا تو اب اسے چاہئے کہ اتنی ہی مسافت اور اسی درجہ کا ایک ٹکٹ خرید کر چاک کردے تاکہ گورنمنٹ کا نقصان نہ ہو۔ (۱)

مولوی نذیر صاحب دہلویؒ (۱۸۳۶-۱۹۱۲ء):

جماعت اہل حدیث کے ایک بڑے عالم مولانا نذیر صاحب دہلوی ہندوستان کو دارالحرب نہیں بلکہ دارالاسلام کہتے ہیں:

> ''دارالحرب سے مراد وہ ملک ہے جس میں کافروں کی عملداری ہو اور وہاں کا حاکم مذہبی ضد سے مسلمانوں کے فرائض اسلامی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے بجالانے کے لیے روکے اور منع کرے۔ایسے ملک میں مسلمانوں کو رہنا درست نہیں۔خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ہندوستان باوجودیکہ نصاریٰ کی عملداری سے دارالحرب نہیں ہے۔اس لیے یہاں بجا آوری فرائض میں کسی طرح کی روک ٹوک نہیں، اور جو طاعون کی وجہ سے حاجیوں کو سفر حجاز سے روکا جاتا ہے تو یہ روکنا حکماً نہیں بلکہ عارضی اور صلاح ومشورہ کے طور پر ہے اور اس سے زیادہ روک ٹوک تو مصر اور روم میں جاری ہے

---

(۱) ایضاً،ص:۴۹

جہاں اسلامی حکومت ہے کہ مرض طاعون متعدی ہے ایک
سے اڑ کر دوسرے کو لگ جاتا ہے ،موسم حج میں بہت سے
لوگوں کا اژدھام ہوگا تو خوف ہے کہ کہیں مری نہ پھیل جائے
پس اگر اس کو روک ٹوک سمجھا بھی جائے تو نہ اس لیے کہ لوگ
فریضۂ حج نہ ادا کریں بلکہ اس لیے اور صرف اس لیے ہے
کہ حاجیوں کی جانیں ضائع نہ ہوں۔''(۱)

مولانا ابو سعید محمد حسین بٹالویؒ (۱۸۴۰-۱۹۲۰ء):

یہ بھی فکر اہل حدیث کے بڑے عالم تھے،انہوں نے ایک رسالہ ''الاقتصاد فی مسائل الجہاد'' بھی لکھا تھا اس میں انہوں نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے سے انکار کیا ہے:

''جس شہر یا ملک میں مسلمانوں کو مذہبی فرائض ادا کرنے کی
آزادی حاصل ہو وہ شہر یا ملک دارالحرب نہیں کہلاتا پھر اگر وہ
دراصل مسلمانوں کا ملک یا شہر ہو۔اقوام غیر نے اس پر تغلب
پالیا ہو۔(جیسا کہ ملک ہندوستان ہے) تو جب تک اس میں
شعائر اسلام کی آزادی رہے وہ بحکم حالت قدیم دارالاسلام
کہلاتا ہے،اور اگر وہ قدیم سے اقوام غیر کے قبضۂ تسلط میں
ہو،مسلمانوں کو انہی لوگوں کی طرف سے ادائے شعار مذہبی کی
آزادی ملی ہو تو وہ بھی دارالاسلام اور کم سے کم دارالسلم
والامان کے نام سے موسوم ہونے کا مستحق ہے۔''(۲)

---

(۱) ایضاً،ص:۵۱۔۵۲
(۲) ایضاً،ص:۵۰

مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ (۱۸۵۶-۱۹۲۱ء):

بریلوی مکتب فکر کے بڑے عالم مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے ایک فتویٰ دیا تھا یہ فتویٰ، فتاویٰ رضویہ کی چودھویں جلد میں شامل ہے اسی طرح ایک رسالہ بھی ''اعلام الاعلام بان ہندوستان دارالاسلام'' کے نام سے شائع ہوا، تعجب کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کی شرعی حیثیت پر اب تک متعدد کتابیں اور رسالیں شائع ہوئے ہیں، ان میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی کتاب ''نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت'' اسی طرح مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی کتاب ''دارالحرب اور دار الاسلام'' مولانا احمد رضا خاں کے فتویٰ کا ذکر نہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے کیا ہے اور نہ ''دارالحرب اور دارالاسلام'' میں کہیں تذکرہ ہے۔ انہوں نے اپنے فتویٰ میں دلائل وشواہد کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ ہندوستان دارالاسلام ہے۔ واضح رہے کہ اس فتویٰ میں مولانا نے دارالحرب اور دارالاسلام پر فقہاء کے اقوال نقل کیے ہیں، اس کو یہاں چھوڑ کر صرف ان کی رائے پیش کی جارہی ہے:

> اقول: وباللہ التوفیق (میں کہتا ہوں اور توفیق اللہ تعالیٰ سے ہے) اس پر دلیل دو چیزیں ہیں: اول یہ کہ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ جو مذہب کے ترجمان ہیں ان کا یہ قول کہ وہ علاقہ امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین شرطوں سے دار الحرب بنتا ہے ان میں سے ایک یہ کہ وہاں کفار کے احکام اعلانیہ جاری کیے جائیں اور کوئی اسلامی حکم نافذ نہ ہو، تو غور کرو کہ انہوں نے آخری جملہ کیسے زائد فرمایا اور صرف پہلے جملہ پر اکتفاء نہ فرمایا، اگر فقہاء کا کلام ہمارے ذکر کردہ بیان

سے واضح بھی کیا جائے تو صرف امام صاحب کا کلام ہی فیصلہ کن ہے تو یہی فیصلہ کن کلام کافی ہے۔ دوسری چیز یہ کہ یہی وہ علماء کرام ہیں جنہوں نے دارالحرب کے متعلق فرمایا کہ وہ دارالاسلام بن جاتا ہے جب اس میں اسلامی احکام مراد لیں (جس طرح کہ دارالحرب کے لیے کفار کے بعض احکام تم نے مراد لیے) تو جب بعض اسلامی احکام کے ساتھ کچھ احکام کفار ہوں گے تو اس سے دارالحرب اور دارالاسلام کے درمیان فرق ختم ہو جائے گا، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک میں دونوں قسم کے حکم پائے جائیں گے اگرچہ کفار کے احکام زائد ہوں تو لازم آئے گا کہ ہر ایک دارالحرب اور دارالاسلام بھی ہو کیونکہ دونوں پر ہر ایک کی تعریف صادق آئے گی، اگر تم یہاں یہ مراد لو کہ ہر دار میں اس کے تمام احکام وہاں نافذ ہوں اور ایک دوسرے کے احکام سے خالی ہوں یعنی دارالحرب وہ ہے جس میں تمام احکام خالص کفر کے ہوں اور دارالاسلام وہ ہے جس میں خالص اسلامی احکام ہوں، تو اس سے لازم آئے گا کہ جس دار کی بحث ہو رہی ہے وہ دونوں داروں میں واسطہ کہلائے گا یعنی وہ نہ دارالاسلام ہو نہ دارالحرب ہو، حالانکہ ایسے دار کا کوئی بھی قائل نہیں، اگر تم یہ مراد لو کہ ثانی یعنی دارالاسلام میں تو خالص اسلامی احکام ہوں اور دوسرے یعنی دارالحرب میں خالص ہونا ضروری نہیں تو اس سے شارع کا مقصد اعلاء

کلمہ اسلام اور اس کی ترجیح فوت ہوجائے گی جو شارع کے مقصد کے خلاف ہے جبکہ علماء نے بہت سے احکام ''**الاسلام یعلو ولایعلیٰ** ''(اسلام غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا) کے قاعدہ پر مبنی قرار دیئے ہیں، علاوہ ازیں یہ بھی لازم آئے گا کہ تمام دارالاسلام صاحبین کے مذہب پر دارالحرب قرار پائیں جبکہ ان میں کچھ احکامِ کفر پائے جاتے ہوں یا اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے خلاف وہاں حکم نافذ پائے جاتے ہوں جیسا کہ آج کے دور میں مشاہدہ ہے بلکہ قبل ازیں بھی ایسا رہا ہے جب سے شریعت کے بارے میں سستی ظاہر ہوئی اور مسلمان حکام نے شرعی احکام کے نفاذ سے روگردانی کر رکھی ہے، اور ذمی حضرات کو ترقی ملی ہے کہ خلافِ شرع ذلیل کی ذلت سے نکل کر بڑی عزت پا رہے ہیں جن کو مسلمان حکمرانوں نے بلند منصب اور محفوظ مراتب عطا کر رکھے ہیں یہاں تک کہ وہ مسلمانوں پر تعلّی کرنے لگے ہیں، اللہ تعالیٰ ایک قائل پر رحم فرمائے جس کا کلام مولانا شامی نے نقل کیا ہے۔(شعر کا ترجمہ)

''دوستو! زمانہ کے مصائب کثیر ہیں، ان میں سے سخت ترین بیوقوف لوگوں کا اقتدار ہے، تو کب زمانے کا نشہ ختم ہوگا جبکہ ملک یہودی بن کر فقہاء کی ذلت گاہ بن چکا ہے''۔ اور جیسا کہ بعض ظالم حکمرانوں نے کافر لیڈروں کی جاری کردہ کئی بدعات کو پسند کرتے ہوئے اپنے ملکوں میں جاری کردیا مثلاً

گواہوں سے حلف لینا،اور ٹیکس، چونگیاں اور لوگوں کے اموال اور نفوس پر باطل قسم کے محصولات لاگو کر دیئے، یہ پریشان کن برے معاملات مسلمان ملکوں میں ماننے پڑیں گے لہذا ضروری ہے کہ پہلے مقام یعنی دارالحرب میں خالص مکمل احکام کفر ہوں اور دوسرے یعنی دارالاسلام میں ایسا نہ ہو جبکہ یہی مدعی ہے،تو اس سے واضح ہوگیا کہ وہ دار جس میں دونوں قسم کے احکام کچھ کفر کے اور کچھ اسلام کے پائے جائیں جیسا کہ ہمارا یہ ملک ہے،صاحبین کے مذہب پر بھی دارالحرب نہ ہوگا کیونکہ یہاں کا خالص محض احکام کفر نہیں ہیں تو ہمارے بعض معاصرین کا یہ گمان کہ ہندوستان سے دارالحرب کی نفی کی بنیاد صرف امام صاحب کا مذہب ہے،اس کا وہم ہے کہ صاحبین کے مذہب پر درست نہیں ہے اس نے طویل کلام کیا جبکہ اس کی ضرورت نہیں تھی،کمزورترین اور سب سے خطرناک موقف وہ ہے جو ہمارے زمانہ کے مشہور اجلہ حضرات کو لاحق ہوا ہے کہ انہوں نے ہمارے اس ملک سے دارالحرب کی نفی کی بنیاد شرط ثانی یعنی کسی دارالحرب سے اتصال کے نہ پائے جانے کو قرار دیا ہے اور انہوں نے اتصال کے معنی لیا ہے کہ چاروں طرف سے دارالحرب میں گھرا ہوا ہو اور کسی طرف سے دارالاسلام سے نہ ملا ہوا ہو چونکہ اتصال کا معنی ہندوستان میں نہیں پایا جاتا لہذا یہ دارالحرب نہ ہوگا کیونکہ ہندوستان غربی جانب سے افغانوں

کے ملک پشاور اور کابل وغیرہ دار الاسلام سے ملا ہوا ہے، اقول:(میں کہتا ہوں کہ) کاش وہ سرحدوں کے معنی پرغور کر لیتے ،یااسلامی سرحدوں کی نگرانی کی فضیلت کودیکھتے ہوئے رباط کے معنی پرغور کر لیتے یا یہ معلوم کر لیتے کہ مکہ، شام،طائف،حنین،اور بنی مصطلق کے علاقے وغیرہا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک زمانہ میں دارالحرب تھے حالانکہ ان سب کا دارالاسلام سے اتصال تھا،یایہی سمجھ لیتے کہ مسلمان امام جب کفار کے کسی علاقہ کوفتح کر کے وہاں اسلامی احکام جاری کر دیتا تو وہ علاقہ دارالاسلام بن جاتا ہے جبکہ اس سے متصل باقی علاقے جوکفار کے قبضہ میں بدستور ابھی تک موجود ہیں وہ پہلے کی طرح دارالحرب ہیں،یاان کو سمجھ آتی کہ جوکچھ وہ کہہ رہے ہیں اگر صحیح ہوتو پھر دنیا بھر میں کوئی بھی دار کفر اس وقت تک دارالحرب نہ کہلائے جب تک ان میں اور دارالاسلام میں سمندروں اور بیابانوں کا فاصلہ نہ ہو، حالانکہ کوئی بھی دارالحرب کے اس معنی کا قائل نہیں ہے، یہ اس لیے کہ جب آپ کسی ملک کو دارالحرب کہیں گے تو ہم استفسار کریں گے کہ اس کے ارگرد کن ملکوں کا احاطہ ہے اگر کوئی بھی ان میں سے دارالاسلام ہوتو پہلا ملک (دارالحرب) بھی دارالاسلام قرار پائے کیونکہ وہ اتصال جو دارالحرب کا معیار ہے وہ نہ پایا گیا،ورنہ اگرارد گرد اسلامی ملک نہ ہوتو پھر ہم اس سے ملنے والے دوسرے ملک کی بابت معلوم کریں

گے حتیٰ کہ ملتے ملاتے کوئی دارالاسلام پایا گیا تو یہ درمیان والے تمام ملک دارالاسلام ہو جائیں گے کیونکہ ان ملکوں کا آپس میں ایک دوسرے سے اتصال ہو گیا ہے، یا پھر یہ تسلیم کیا جائے کہ اس جہت میں کرۂ ارض میں کوئی بھی دارالاسلام نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ دارالحرب کے اس میعاد والے قول کا فساد واضح ہے جس میں کچھ بھی خفاء نہیں ہے، اس کی بنیاد یہ فاسد قیاس ہے کہ امام صاحب کے نزدیک کسی دارالاسلام کے دارالحرب بننے کے لیے یہ شرط ہے کہ چاروں اطراف سے وہ ملک دارالاسلام میں گھرا ہوا نہ ہو کیونکہ اگر وہ گھرا ہوا ہو تو اس دارالحرب میں کفار کا غلبہ معرض سقوط میں رہے گا تو یوں وہ دارالاسلام سے خارج نہ رہے گا، لہٰذا انہوں نے خیال کر لیا کہ کسی ملک کے حربی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ چاروں طرف سے حربی ملکوں میں گھرا ہوا ہو، یہ قیاس نہایت ہی فاسد ہے جو عوام الناس کے لیے بھی مخفی نہیں۔''(۱)

مذکورہ تمام فتاویٰ جات کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق واعتماد سے عرض کی جاسکتی ہے کہ فقہاء نے ہندوستان کو دارالاسلام اس وقت قرار دیا تھا جب ہندوستان آزاد نہیں تھا، بلکہ ملک پر انگریزوں کا تسلط تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ فقہاء کے یہاں دار کی جو تقسیم کی گئی ہے، ان کی تعریفات وتعین میں بڑا اختلاف ہے، اسی طرح یہ بات عرض کرنا چاہوں گا کہ جو اصطلاحات فقہاء نے دار کے حوالے سے بیان کی ہیں وہ فقہاء کی اپنی اصطلاحات

(۱) دیکھیے پوری تفصیل، احمد رضا خاں: اعلام الاعلام بان ہندوستان دارالاسلام، ص: ۱۔۱۰

ہیں،قرآن وحدیث سے اس طرح کی تقسیم نہیں ہوتی ہے۔ رہا ہندوستان کا سوال تو یہاں صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کو اس وقت مسلمان دارالاسلام مانتے تھے جب یہاں فرنگیوں کا قبضہ تھا اور ملک آزاد نہیں ہوا تھا۔

آزاد ہندوستان کی شرعی حیثیت:

اس بابت دوسری بحث اس وقت شروع ہوئی جب ہندوستان آزاد ہوگیا،آزادی اور تقسیم ہند کے بعد ملک میں نفرت وتشدد اور تعصب وعناد میں اضافہ ہوا،مسلمانوں اوران کے دین ودھرم ہی نہیں بلکہ بعض تنظیموں نے مسلمانوں کی حب الوطنی تک کو مشکوک قرار دیا،اسی طرح بعض شدت پسند عناصر نے مسلمانوں پر یہ الزام بھی عائد کیا کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ ہندوستان کو دار الحرب مانتا ہے کئی مرتبہ یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ ہندوستان کو مسلمان دارالامن قرار دیں۔سابقہ سطور میں جن نظریات وافکار اور فقہ وفتاویٰ کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان میں تمام فقہاء کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان دارالحرب نہیں بلکہ دارالاسلام اوردارالامن ہے، چہ جائیکہ ایک دوافراد جیسا کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی وغیرہ نے کہا ہے۔البتہ شاہ عبدالعزیزؒ کے فتویٰ کے متعلق مولانا سعیداحمد اکبرآبادی نے لکھا ہے:

> ''ہندوستان جوفقہاء کی اصطلاح کے مطابق چھ سو برس سے دارالاسلام بنا چلا آ رہا تھا۔ان حالات نے شاہ صاحب جیسے مفکر کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ وہ اب بھی دارالاسلام ہے یا نہیں؟ اگرچہ ہماری نظر سے کہیں نہیں گذرا کہ شاہ صاحب نے ملک کو دارالحرب کہا ہو لیکن وہ ملک کا جو نقشہ کھینچتے اور اس کے جو حالات بیان کرتے ہیں وہ ہرگز کسی دارالاسلام کے

نہیں ہو سکتے۔"(۱)

رہا سوال مولانا گنگوہی کا تو یہ بتادوں کہ ان کے متعلق ہندوستان کی شرعی حیثیت کے حوالے سے تین اقوال پائے جاتے ہیں:

(الف) ہند دارالحرب ہے۔

(ب) ہند کے متعلق بندہ کو خوب تحقیق نہیں ہے۔

(ج) ہند دارالامان ہے۔

اس کے ساتھ مولانا سعید اکبرآبادی نے لکھا ہے کہ جو ان کی طرف منسوب مطبوعہ فتویٰ ہے اس کے حاشیہ کے علاوہ بھی ایک عبارت لکھی ہے، جس میں ہندوستان کو دارالامان کہا گیا ہے:

"یہاں یہ بات ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ آج کل ہندوستان باستثناء اسلامی ریاستوں کے اگرچہ حضرت مجیب (مولانا گنگوہی) اور حضرت شاہ عبدالعزیز اور بعض دیگر اکابر کی تصریح کے مطابق دارالحرب ہے، مگر واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دارالامان ہے۔"(۲)

علاوہ ازیں مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے مولانا گنگوہی کے اقوال کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے:

"حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانے سے لے کر انیسویں صدی کے ربع آخر تک کے حالات کا جو نہایت مختلف اور سرسری جائزہ لیا ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اس پوری مدت میں ملک کے حالات یکساں نہیں رہے بلکہ ادلتے بدلتے

(۱) ایضاً ص:۳۶-۳۷

(۲) ایضاً ص:۳۵

رہے ہیں اور جوں جوں تغیر ہوتا رہا ہے، بحیثیت مجموعی علماء
کا اس ملک کے متعلق شرعی نقطۂ نظر بھی بدلتا رہا ہے، اس بناء
پر مولانا گنگوہی سے اگر اس سلسلہ میں تین قول ثابت ہیں تو
یہ حیرت کی بات نہیں ہے بلکہ یہ حالات کے تغیر کا اثر ہے،
چنانچہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا نے پہلا فتویٰ بزبان فارسی
وشائع کردہ مفتی محمد شفیع صاحب یا تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزاد
سے پہلے کا ہے یا اس کے فوراً بعد کا ہے جبکہ پکڑ دھکڑ بڑے
پیمانے پر جاری تھی اور ادھر مجاہدین بھی سرگرم عمل تھے، اس
کے بعد جب ذرا حالات بہتر ہوئے، مگر مطلع بالکل صاف
نہیں ہوا تھا، تو مولانا کو اب پہلی رائے پر اصرار تو نہیں
رہا، لیکن ساتھ ہی کھل کر دار الحرب ہونے کی نفی نہیں کر سکے،
پھر جب حالات اور زیادہ بہتر ہوئے، امن وامان مکمل طور پر
بحال ہوگیا اور مذہبی فرائض ومعمولات بلا خوف وخطر ادا
ہونے لگے تو اب حضرت گنگوہی نے اس کو دار الامان ہی قرار
دیا۔"(۱)

اس تناظر میں یہ بات نکل کر سامنے آتی ہے کہ ہندوستان کو دار الحرب ہونے کا فتویٰ کبھی بھی نہیں دیا گیا، ہاں اگر کسی نے اس طرح کا فتویٰ دیا بھی ہے تو وہ اس وقت کے حالات کی بنیاد پر دیا ہوگا، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملک اب آزاد ہے اس کا باقاعدہ دستور اور قانون ہے، جو ہندوستان میں رہنے والی تمام رعایا کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے، تو ایسی صورت میں ہمارے ملک کی شرعی

(۱) ایضاً، ص:۴۳

حیثیت کیا ہے،اسی طرح ہمارے بعض برادران وطن بھی یہ سوچتے ہوں گے کہ مسلمان ہندوستان کوشرعی اعتبار سے کیا مانتے ہیں؟

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ (۱۹۰۸-۱۹۸۵ء):

یہ بات آچکی ہے، مولانا نے ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق ایک کتاب تحریر کی ہے، اس کتاب میں انہوں نے دارالاسلام اوردارالحرب کی تعریف اوراس کا مفہوم بڑی تفصیل سے بتایا ہے۔اس کے بعد انہوں نے ہندوستان کے متعلق جورائے پیش کی ہے اس کو ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

''فقہاء نے دارالحرب کی تعریف کے سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے اور پھر ہندوستان میں دستوری طور پر مسلمانوں کو جو پوزیشن حاصل ہے، ان سب کو پیش نظر رکھا جائے تو حسب ذیل تنقیحات پیدا ہوتی ہیں:

۱۔ ہندوستان چونکہ ایک سیکولر جمہوری ملک ہے اس لیے یہاں کسی مذہب یا کسی مذہبی فرقہ کی حکومت نہیں ہے، اس بناء پر فقہاء کی اصطلاح میں ''غلبۂ کفر'' صادق نہیں آتا۔

۲۔ شہری حکومتوں میں یکساں ہونے کے باعث مسلمان حکومت میں شریک ہیں۔

۳۔ مذہبی آزادی کی دفعہ کے ماتحت مسلمانوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہے۔

۴۔ مسلمانوں کو معاش اور تقریر و تحریر کی آزادی بھی حاصل ہے۔

۵۔ انڈین یونین کے ڈپلومیٹک تعلقات تمام اسلامی ملکوں سے ہیں۔اس کے علاوہ دوستانہ تعلقات و مراسم بھی ہیں کسی سے زیادہ تو کسی سے کم۔

۶۔ انڈین یونین کی شمالی مغربی سرحد مسلم ممالک سے متصل ہے، لاہور سے ہوکر مراکش تک یہ سلسلہ چلا گیا ہے۔

پھر آگے لکھتے ہیں:

مذکورہ تنقیحات کی روشنی میں یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ دارالحرب ہونے کے جو شرائط ہیں اور جو ایک لفظ''استیلاء'' (غلبۂ طاقت) میں جمع ہوگئے ہیں (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں) ان میں سے چونکہ کوئی ایک شرط نہیں پائی جاتی، اس لیے ہندوستان ہرگز دارالحرب نہیں ہے، اور نہ اس جیسا کوئی دیگر جمہوری ملک جس میں غیر مسلموں کی اکثریت ہو، دارالحرب ہوسکتا ہے، اس کے بعد ماہنامہ الرحیم حیدرآباد (مغربی پاکستان) کے حوالہ سے ڈاکٹر صغیر معصومی کا اقتباس نقل کرتے ہیں:

> ''دارالحرب کی جو تعریف بیان کی گئی ہے، نیز قرون اولیٰ میں دارالحرب و دارالاسلام کے جو تعلقات تھے اور جو جنگی نتائج مرتب ہوتے تھے، ان سب پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ آج کل کی سلطنتوں اور ریاستوں کی جہاں بدنظمی نہیں بلکہ ایک خاص نظام قائم ہے اور مسلمان نہ صرف امن وامان سے رہتے ہیں بلکہ اپنی تعداد کے مطابق سیاسی امور میں بھی حصہ لیتے ہیں، دارالحرب قرار نہیں دیا جاسکتا ہے''۔(۱)

اس طرح مولانا نے ایک اور اقتباس پروفیسر محمد شریف کا لکھا ہے:

> ''ہندوستان کا دستور اگرچہ سیکولر ہے لیکن اس میں عقیدہ، عمل اور مذہب کی جو آزادی دی گئی ہے وہ بعینہٖ وہ ہے جو اسلام دیتا ہے، اس بناء پر لفظوں کا فرق ہے ورنہ پاکستان کی

(۱) ایضاً ص: ۷۱۔۷۲

اسلامی ریاست اور ہندوستان، آسٹریلیاءاورامریکہ کی سیکولر
اسٹیٹ یہ سب ایک ہی ہیں۔''[۱]

اسی طرح مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوستان نہ دارالاسلام ہے، نہ دارالحرب اورنہ دارالامن والمعاہدہ ہے، بلکہ یہ ایک آزادسیکولر ملک ہے،اوریہ سب کا ہے جوانڈین نیشنلٹی رکھتے ہیں۔

مولانا خالدسیف اللہ رحمانی نے ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق نہایت اہتمام اوراطمینان بخش بحث کی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

'' موجودہ دورمیں جوغیرمسلم مملکتیں ہیں،ان میں بعض تووہ ہیں جواسلام یامطلقاً مذہب کی معاند ہیں، جہاں نہ مذہبی تشخصات کے ساتھ مسلمان زندہ رہ سکتے ہیں اورنہ اسلام کی دعوت دے سکتے ہیں، جیسے کمیونسٹ بلاک کے ممالک یا بلغاریہ وغیرہ، دوسری قسم کے ممالک وہ ہیں جہاں مغربی طرز کی جمہوریت رائج ہے،جن میں یاتو سلطنت کا کوئی مذہب نہیں ہوتااورتمام قومیں اپنے اپنے مذہب پرعمل کرنے میں آزادہوتی ہیں، جیسےخودہمارا ملک ہندوستان ہے، یا سلطنت کاایک مذہب ہوتاہے لیکن دوسری مذہبی اقلیتیں بھی اپنے مذہبی معاملات میں آزادہوتی ہیں،اوران کواپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کی اجازت ہوتی ہے،جیسے امریکہ، برطانیہ وغیرہ۔ایک آدھ ملک ایسے بھی ہیں جہاں قدیم بادشاہت باقی ہے،لیکن وہاں بھی مذہبی اقلیتوں کو مذہبی حقوق حاصل

---

(۱) ایضاً،ص:۳۰۷

نہیں۔میرے خیال میں پہلی نوع کے ممالک یعنی کمیونسٹ ممالک ''دارالحرب'' کے زمرے میں ہیں۔بعض کمیونسٹ ممالک میں مذہبی آزادی اوراظہاررائے وغیرہ کے حقوق میں ایک گونہ نرمی پیدا کی گئی ہے،تاہم اب بھی وہ دارالحرب ہی ہیں،اس کے علاوہ جوممالک ہیں وہ سبھی ''دارالامن'' میں شمار کیے جاسکتے ہیں اور یہ بات ہے کہ مختلف ملکوں میں مذہبی حقوق کے معاملہ میں ایک گونہ تفاوت بھی پایا جاتا ہے، ہندوستان ان ممالک میں ہے جس کے ''دارا لامن'' ہونے میں کوئی شبہ نہیں، جمہوری نظام کی وجہ سے مسلمان اس ملک کے اقتدار میں شامل ہیں،عبادت اور عقیدہ وغیرہ کی آزادی کے معاملہ میں ان کو وہی حقوق حاصل ہیں جو اکثریتی فرقہ کو حاصل ہیں۔دعوت وتبلیغ کی اجازت بہت سے مسلم ممالک سے زیادہ یہاں ہے، شخصی قوانین جتنے ان کے محفوظ ہیں اکثریتی فرقہ کے بھی نہیں ہیں۔سلطنت کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہے، رہ گئے فرقہ وارانہ فسادات اوران میں بعض طبقوں کی طرف سے تعدی کا پایا جانا جو قانون ملکی کے لحاظ سے ایک غیرآئینی فعل ہے اور جرم ہے یہ کسی ملک کے ''دارالامن'' ہونے کے مغایر نہیں ہے۔''(۱)

اسی طرح ایک فتویٰ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی کے استاد مفتی سلمان منصور پوری کا ملتا ہے یہ فتویٰ ان کی معروف کتاب ''کتاب النوازل'' میں شائع

(۱) قاسمی، مجاہدالاسلام، مجلّہ فقہ اسلامی، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، ص:۲۳۲-۲۳۳

ہوا ہے، انہوں نے بھی ہندوستان کو دارالامن و دارالجمہوریہ قرار دیا ہے۔ ذیل میں فتویٰ پیش کیا جارہا ہے:

''الجواب وباللہ التوفیق: شریعت میں دارالاسلام اور دار الحرب کے احکامات بالکل جداگانہ ہیں، اور فقہاء نے ان کے متعلق شرائط بھی الگ الگ ذکر فرمائی ہیں، پہلے دور میں عموماً ان شرائط کا تحقق کسی ایک طرح کے دار پر بآسانی ہوسکتا تھا، اسی لئے کسی جگہ کو دارالاسلام یا دارالحرب قرار دینے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آتی تھی؛ لیکن اب نیا عالمی نظام اور ملکوں کا سرحدی تعین اور ملک میں بسنے والے شہریوں کے آپسی معاہدے اور دستور اِس انداز کے بن گئے ہیں کہ ان جگہوں پر حتمی طور پر دارالحرب یا دارالاسلام ہونے کا حکم لگانا سخت دشوار ہے، کیوں کہ ایسی جگہوں پر نہ تو مسلمانوں کو مطلق اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے، اور نہ ہی ان کی مذہبی آزادی میں قانوناً کوئی دخل اندازی ہوتی ہے، ایسی جگہوں میں ہمارا ملک ہندوستان بھی شامل ہے، اس میں اگرچہ حکومتی سطح پر اسلامی قوانین جاری نہیں، لیکن دوسری طرف دستوری اعتبار سے مسلمانوں کو بھی وہی شہری حقوق حاصل ہیں جو غیر مسلموں کو ہیں، اِسی دستور کی بنیاد پر مسلمان اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں اور ملک کی عدالتیں جائز شکایتوں کو سن کر اُن کے ازالہ کی کوششیں کرتی ہیں، لہٰذا ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر اُن رخصتوں سے فائدہ

اٹھانے کی کوشش کرنا جو فقہاء نے دارالحرب میں رہنے والوں کے لئے دی ہیں، دیانت وانصاف کے خلاف ہے، اِسی لئے اکابر مفتیان نے ہندوستان کو دارالامن یادار الجمہوریہ کا نام دیا ہے، اور یہاں جمعہ وعیدین کے قیام، قوتِ نافذہ کے بغیر محاکم شرعیہ کو قائم کرنے نیز قومی وملی مسائل کے حل کے لئے تنظمیں بنانے کی اجازت دی ہے، جب کہ مالی معاملات میں وہ تمام پابندیاں برقرار رکھی ہیں جو دارالاسلام میں رہنے والے مسلم شہریوں پر ہوتی ہیں، ظاہر ہے کہ احتیاط والا موقف یہی ہے، اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔‘‘(۱)

وقد اتفقت الامة على ان الخروج من الخلاف مستحب قطعًا، لان خلاف الامة لا سيما خلاف جمهورهم يورث شبهة في الجواز، وقال النبي صلى اللّٰه عليه وسلم: ’’الحلال بين والحرام بين، وبينهما مشبهات، فمن اتقى الشبهات فقد استبرا لدينه‘‘ لا سيما وكون الهند دار الحرب عند الإمام محل نظر بعد، فالشبهة إذا قوية غير ضعيفة والتوقي عنه واجب من غير ريبة. (۲)

دار الحرب على قول ابى حنيفة لا تصير إلا بثلاثة اشياء: احدها ان تكون متصلة بدار

---

(۱) مستفاد: فتاویٰ محمودیہ۱۶، ۵۵۲، ڈابھیل

(۲) إعلاء السنن/ باب الربا، ۱۴، ۶۳، ۷، إدارة القرآن کراچی

الـحـرب ليس بينها وبين دار الحرب موضع فی يـد اهـل الإسـلام، والثـانـی ان يجری فيهـا اهل الـحرب احكامهم، والثالث ان لا يبقی فيه مسلم او ذمـی آمـن بـالامـان الاول. (فتاویٰ خانية علی هـامش الهندية، كتاب السير باب الردة وأحكام أهلها، فصل فيما يبطله الارتداد ۳، ۴۸۵ زكريا) ودارالإسـلام لا تـصيـر دارالحـرب إلا بـإجـراء احـكـام الشـرک فيهـا، وان تـكون متصلة بدار الـحـرب لايـكـون بينهما وبين دارالحرب مصر آخر للمسلمين، ولا يبقی فيها مسلم او ذمی آمنا بـالامـان الاول، فـمـا لـم تـوجد هٰذه الشرائط لا تصير دار الحرب. [1]

فی سير الأصل لأبی اليسر: أن دار الإسلام لا يصير دار الـحـرب مـا لـم يبـطـل جميع ما صارت به دار الإسلام؛ لأن الحكم إذا ثبت لعلته فما بقی شیء من الـعـلة، يبـقـی بتـمـامــه، وفی المنشور دار الإسلام بـإجـراء أحـكـام الإسـلام، فما بقی علقةٌ من علائق الإسلام يترجح بجانب الإسلام. [2]

وذكـر الـحـلـوانـی إنما تصير دار الحرب بإجراء احكام الكفر، وان لا يحكم فيها بحكم من احكام

---

(۱) خزانة المفتيين بحواله فتاویٰ محموديه ۲۱، ۵۵۳ ڈابهيل

(۲) مجموعة الفتاویٰ / كتاب الصلاة ، ۱، ۸۳۲، كراچی

الإسلام، وان يتصل بدار الحرب وان لا يبقى فيها مسلـم ولا ذمـى آمـنًـا بالامان الاول،فإذا وجدت الشـرائـط كلها صارت دارالحرب، وعند تعارض الـدلائـل والشـرائـط يبـقى ما كان على ما كان او يتـرجـح جـانـب الإسـلام احتيـاطا. وظاهر أنه إذا جـرت أحكام المسلمين وأحكام أهل الشرک لا تكون دار الحرب. (۱)

علاوہ ازیں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اپنی کتاب ''دارالاسلام اوردارالحرب'' میں دارالحرب اوردارالاسلام پر بحث کرنے کے بعد ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق لکھا ہے:

''جن بلاد پر دوبارہ غیرمسلموں کا تسلط ہوگیا،ان میں اگر احکام اسلام (اعلان اذان واقامت جمعہ وعیدین ،نکاح وطلاق بطریقۂ اہل اسلام وغیرہ وغیرہ) جاری ہیں اوران کا کسی دارالحرب سے سرحدی اتصال نہیں ہے،اوراس میں مسلمانوں کو جدید استیمان کی ضرورت نہیں پڑی، بلکہ وہ امان سابق کے ساتھ رہ رہے ہیں تو وہ دارالاسلام حکمی ہیں جیسے ہندوستان۔'' (۲)

ہندوستان کا موجودہ شرعی حکم کے حوالہ سے جوآراء وافکاراورفقہ وفتاوىٰ پیش کئے گئے ہیں ،ان کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان دار الامن ہے،لہٰذا اگران حقائق کوپڑھنے کے بعدکوئی اعتراض کرتاہے کہ

---

(۱) فتاوىٰ البزازیۃ علی ہامش الہندیۃ، کتاب السیر/فصل فی الحظر والإباحۃ ۶، ۲۱۳زکریا)فقط واللہ تعالیٰ اعلم''۔

(۲) اعظمی، حبیب الرحمٰن (مولانا)، دارالاسلام اوردارالحرب، مرکزتحقیقات وخدمات علمیہ، مئو، ۲۰۰۲ء، ص:۲۲-۲۳

ہندوستان کے متعلق مسلمانوں کے افکار درست نہیں ہیں تو وہ صرف اس کے ذہن کی پیداوار ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے ہمیشہ سے اپنا وطن سمجھا اور جانا ہے، یہاں کی خوشی اور غم میں ہمارا برابر کا حصہ رہا ہے، راقم کی بھی رائے یہی ہے کہ یہ ایک آزاد سیکولر اور پرامن ملک ہے جہاں تمام طبقات کو تمام طرح کے بنیادی حقوق، خواہ وہ دینی قبیل سے ہوں یا دیگر شخصی اور دستوری حقوق ہوں، سب میں آزادی حاصل ہے۔

مشترک سماج اور شرعی احکام:

یہاں یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان تکثیریت اور تنوع کا علمبردار ہے، متعدد ادیان، زبانیں، تہذیبیں اور رسم ورواج ہیں، جو ہندوستان کی عظمت اور اس کی رفعت میں چار چاند لگاتے ہیں، لہٰذا اب فطری طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ ایسے مشترک سماج میں مسلمانوں کی کیا ذمہ داری ہے اور مذہب اسلام ان سے کیا مطالبہ کرتا ہے، یہ بتانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان تشدد پسند یا جارحیت پسند ہوتے ہیں۔ اسی طرح دیگر ادیان ورسوم کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے ہیں یا ان کے دھرم میں دیگر افکار ونظریات اور دین و دھرم کے متعلق نہایت متعصّبانہ نظریہ اپنایا گیا ہے، اس طرح کی باتیں آئے دن ہم سنتے رہتے ہیں۔ چنانچہ متذکرہ بالا تمام شکوک وشبہات کو دور کرنے کے لیے اور تکثیری یا مشترک کلچر میں مسلمانوں سے اسلام کیا مطالبہ کرتا ہے، اس حوالے سے ذیل کی سطور کو روشن خیالی سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔

تکثیری سماج میں احترام انسانیت:

قرآن مجید میں قتل ناحق کی سخت مذمت آئی ہے۔ کسی بے گناہ شخص کا خون پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔ اور کسی بے قصور شخص کو مارے جانے

سے بچا لینے کو ساری انسانیت کی حفاظت کے برابر قرار دیا ہے۔فرمان الٰہی ہے۔

مَن قَتَلَ نَفساً بِغَیرِ نَفسٍ أَوُ فَسَادٍ فِیُ الأَرُضِ فَکَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیُعاً وَمَنُ أَحُیَاھَا فَکَأَنَّمَا أَحُیَا النَّاسَ جَمِیُعاً (۱)

''جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغیر فساد کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ رکھا سب لوگوں کو۔''

یہاں صرف مسلمان کے قتل ناحق کی ممانعت نہیں بلکہ سب شہریوں کے خون سے روکا گیا ہے۔اگر کوئی شخص ناحق قتل کیا جائے تو شرع اسلامی نے مقتول کے اولیاء کو چارہ جوئی کا حق دیا ہے اور اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ قاتل کو سزا دے۔مولانا مودودی اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''دنیا میں نوع انسانی کی زندگی کا بقا اس بات پر منحصر ہے کہ ہر انسان کے دل میں دوسرے انسان کی جان کا احترام موجود ہو اور ہر ایک دوسرے کی زندگی کے بقا وتحفظ میں مددگار بننے کا جذبہ رکھتا ہو جو شخص ناحق کسی کی جان لیتا ہے وہ صرف ایک ہی فرد پر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل حیات انسانی کے احترام سے اور ہمدردئی نوع کے جذبہ سے خالی ہے لہٰذا وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے کیونکہ اس کے اندر وہ صفت پائی جاتی ہے جو اگر تمام افراد انسانی میں پائی جائے تو پوری نوع کا خاتمہ ہو جائے اس کے برعکس جو شخص انسان کی

---

(۱) المائدۃ:۳۲

زندگی کے قیام میں مدد کرتا ہے درحقیقت انسانیت کا حامی ہے کیونکہ اس میں وہ صفت پائی جاتی ہے جس پر انسانیت کے بقا کا انحصار ہے۔''(۱)

اسی طرح ارشاد ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَن قُتِلَ مَظْلُوماً فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَاناً فَلَا يُسْرِف فِّي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُوراً(۲)

''قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے، مگر حق کے ساتھ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق دیا ہے، پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اس کی مدد کے جائے گی۔''

اس میں یہ شرط نہیں کہ مقتول مسلمان ہو بلکہ یا غیر مسلم (مقتول) کے ورثا کو بھی قصاص لینے کا حق حاصل ہے۔ اس کے متعلق قرآن مجید میں وارد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى (۳)

'' اے ایمان والو! فرض ہوا تم پر (قصاص) برابری کرنا مقتولوں میں۔''

قصاص لینے میں مسلم وذمی کی کوئی تمیز نہیں۔ صاحب قرطبی لکھتے ہیں

(۱) مودودی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، مطبع مرکزی جماعت اسلامی ہند نئی دہلی، سن اشاعت ۱۹۷۰ء، ج:۱، ص: ۴۶۵۔ صاحب تدبر فرماتے ہیں یہ اصل حکم بیان نہیں ہے جو قصاص کے باب میں یہود کو دیا گیا ہے۔ بلکہ اس کی دلیل اور اس کی حکمت وعظمت بیان ہوئی ہے ''جان کے بدلے جان'' کا تورات میں بھی ذکر ہے تدبر قرآن، ج:۲، ص:۵۰۳

(۲) بنی اسرائیل:۳۳

(۳) البقرہ:۱۷۸

قصاص انتقام محض کا مترادف نہیں کہ ہر شخص دوسرے شخص سے لینا شروع کر دے بلکہ قانونِ فوج داری کے ماتحت سزا کی منظّم، مہذب و منضبط ترین شکل کا نام ہے، امت کا ایک قانونی اور اجتماعی حق ہے اس کے اجرا کی ذمہ داری حکومت یا اہل حل و عقد پر عائد ہوتی ہے۔(۱)

ابوبکر جصاص نے بڑی عمدہ بات کہی ہے:

> ''مقتول ذمی کے بدلے میں قاتل مسلمان کا قتل واجب ہے۔ کیونکہ (عام حقوق میں) ایک ذمی اور ایک مسلمان کے مابین کوئی فرق نہیں ہے اور قصاص کے واجب ہونے کا حکم عام ہے۔ اس آیت کریمہ کی رو سے (عام معاملات میں) ایک کافر اور ایک مسلمان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ قصاص کا حکم دونوں پر جاری ہوگا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلیل ہے کہ جو مظلوم قتل ہوا ہو ہم نے اس کے ولی کو دعویٰ کا حق دیا ہے۔''(۲)

تکثیری معاشرے میں عزت وآبرو کی حفاظت:

قرآن مجید میں کسی اجنبی عورت سے جنسی تعلق کو حرام بتایا گیا ہے۔ اسے بے حیائی اور بدچلنی قرار دیا گیا ہے۔ نوع انسانی کو اس قبیح فعل کے قریب پھٹکنے سے بھی منع کیا گیا ہے اور حکم عدولی کی صورت میں مرد وعورت دونوں کے لیے سزا مقرر فرمائی جسے شرعی اصطلاح میں حد کہا جاتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

---

(۱) قرطبی، ابی عبداللہ محمد ابن احمد الانصاری القرطبی، الجامع الاحکام القرآن، مطبع داراحیاء التراث عربی، بیروت لبنان، سن اشاعت، ۱۴۱۶ھ ۱۹۹۵ء، ج:۱، ص:۲۴۵

(۲) جصاص، امام الحجۃ الاسلام ابی بکر احمد بن علی الرازی، الجصاص احکام القرآن، مطبع مصر، سن اشاعت ۱۳۴۷ھ، ج:۱، ص:۱۵۵

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِیُ فَاجلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنُهُمَا مِئَةَ جَلُدَةٍ (۱)

''بدکاری کرنے والی عورت، اور بدکار مرد، سو مارو ہر ایک کو دونوں میں سے سو سو درے۔''

قرآن مجید میں زنا کی ممانعت نیز ارتکاب کی صورت میں سزا کا حکم اس امر کی دلالت کرتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ انسانی معاشرے میں فحاشی و بدچلنی کا مکمل انسداد چاہتا ہے۔ اس میں صرف مسلم ہی نہیں بلکہ معاشرے میں شامل سب کی عصمت کا تحفظ مطلوب ہے۔

اسلام کسی کو بھی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی کی عزت و عصمت پر ہاتھ ڈالیں۔ حکم عدولی کی صورت میں ان پر وہی حد نافذ ہوگی جو کسی مسلمان خاتون کی عصمت دری پر مقرر ہے۔

معاشرے میں کسی پاک دامن پر تہمت لگانا شدید جرم ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں آیا ہے:

وَالَّـذِيُنَ يَرُمُونَ الُمُحُصَنَاتِ ثُمَّ لَمُ يَأْتُوا بِأَرُبَعَةِ شُهَدَاء فَـاجُـلِدُوهُمُ ثَمَانِيُنَ جَلُدَةً وَلَا تَقُبَلُوا لَهُمُ شَهَادَةً أَبَداً وَأُوُلَئِكَ هُمُ الُفَاسِقُونَ (۲)

''اور جو لوگ عیب لگاتے ہیں حفاظت والیوں کو پھر نہ لائے چار مرد شاہد تو مارو انہیں اسی (۸۰) درے اور نہ مانو ان کی گواہی اور وہی لوگ ہیں نافرمان۔''

اس آیت میں پاکدامن عورتوں پر تہمت زنا لگا کر اس کا شرعی ثبوت یعنی چار عاقل بالغ ہونے کے لیے مسلمان ہونا ضروری نہیں، بلکہ وہ غیر مسلم خواتین

(۱) النور:۲

(۲) النور:۴

بھی ہوسکتی ہیں۔اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم عورت پر تہمت لگائے تو اس پر بھی یہ حد جاری ہوگی۔اگر کسی مسلمان نے ذمیہ وغیرہ سے زنا کیا تو اس پر حد جاری کی جائے گی۔(۱)

تکثیری سماج میں معاشی ضروریات کی تکمیل:

معاشرے میں نادار و مفلس افراد کے لیے مالی معاونت کے متعلق ارشاد قرآنی ہے۔

وَفِيۡ أَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالۡمَحۡرُومِ (۲)

''اوران کے اموال میں مانگنے والوں اور (نہ مانگنے والوں)
محروم دونوں کا حق ہے۔''

یعنی یہ محسنین جس طرح خدا کا حق پہچاننے والے ہیں اسی طرح اس کے بندوں کے حقوق بھی ادا کرنے والے ہیں وہ اپنے مالوں میں اپنے نفس ہی کا حق نہیں سمجھتے بلکہ سائلوں اور محروموں کا حق بھی سمجھتے ہیں اور اس کو اسی طرح ادا کرتے ہیں جس طرح اہل حق کے حقوق ادا کیے جاتے ہیں۔(۳)

یعنی سائل اور غیر سائل مساکین ومحتاج لوگوں کی کفالت مسلم معاشرے اور حکومت کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔ان کا مسلمان ہونا شرط نہیں بلکہ اگر محتاج ذمی بھی ہوتو اس کی کفالت کرنا چاہیئے،کفالت کی ترغیب میں ارشاد ہے:

وَيُطۡعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسۡكِيناً وَيَتِيماً وَأَسِيراً (۴)

''اور کھلاتے ہیں کھانا اس کی محبت پر محتاج کو اور یتیم کو اور

---

(۱) فتاویٰ عالمگیری،کتاب الحدود،باب الثالث،مطبع رحیمیہ دیوبند،بدون سن،ج:۲،ص:۲۲۶

(۲) الذاریات:۱۹

(۳) اصلاحی،امین احسن اصلاحی،تدبر قرآن،مطبع تاج پرنٹرس،نئی دہلی سن اشاعت ۱۹۸۹ء،ج:۷،ص:۵۹۴

(۴) الدہر:۸

قیدی کو''۔

سماج میں محتاج و یتیم ذمی بھی ہو سکتے ہیں جنہیں کھانا کھلانا اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب بتایا گیا ہے۔اسی لیے کتاب الخراج میں یہ اصول لکھا ہے کہ اگر ان کے ضعیف العمر اور ناکارہ لوگوں یا آفت رسیدہ یا بعد از غنی فقیر ہو جانے والوں سے جزیہ ہٹالیا جائے گا اور مسلمانوں کے بیت المال سے ان کے نان و نفقہ کا انتظام کیا جائے گا جب تک کہ وہ اسلامی ملک میں رہیں۔(۱)

مثلاً غزوہ بدر کے قیدی مشرکین مکہ تھے جنہیں مسلمان اپنی نسبت بہتر کھانا کھلاتے تھے۔غیر مسلموں پر خرچ کرنے کے متعلق ارشاد ربانی ہے:

لَّيۡسَ عَلَيۡكَ هُدَاهُمۡ وَلَـٰكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَن يَشَآءُ ۗ وَمَا تُنفِقُوۡاْ مِنۡ خَيۡرٍ فَلِأَنفُسِكُمۡ (۲)

''تیرے ذمہ نہیں ان کو راہ پر لانا اور لیکن اللہ راہ پر لاوے جس کو چاہے۔اور جو کچھ خرچ کرو گے تم مال میں سے سو اپنے ہی واسطے۔''

اس جگہ عام اصول بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جس کو مال دو گے تمہیں اس کا ثواب دیا جائے گا۔مسلم و غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ ہر مستحق کو دیا جا سکتا ہے۔ابن حنیفہ سے روایت ہے کہ لوگ اسے ناپسند کرتے تھے کہ مشرکین کو صدقہ دیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تو اب لوگ (نادار) مشرکوں کو بھی صدقہ دینے لگے۔

ان آیات قرآنی سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کے مساکین و محتاج کی کفالت کرنا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔اس کے علاوہ عام لوگوں کو بھی

---

(۱) قاضی،ابو یوسف،یعقوب بن ابراہیم،کتاب الخراج،مطبع،بیروت لبنان،دارالمعرفہ،بدون سن،ص:۱۵۵

(۲) البقرۃ:۲:۲۷۲

ترغیب دی گئی ہے کہ معاشی مشکلات میں ان کے ساتھ تعاون کیا کریں۔

تکثیری سماج اور تحفظ ملکیت:

لوگوں کے ذاتی جائیداد کی حفاظت کے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ (۱)

''اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق''۔

ناحق مال کھانے سے مراد چوری، خیانت، دغابازی، رشوت ستانی اور غصب وغیرہ کے ذریعے کسی کا مال وجائیداد ہتھیانا ہے۔ یہ حکم بھی عام ہے کہ مسلم و ذمی کسی کے مال کو اُن مذکورہ بالا ذرائع سے حاصل کرنا حرام ہے اور حکم عدولی کرنے والا مجرم اور مستوجب سزا ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی ذمی کے مال کی چوری کرے گا تو سزا میں اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ حتیٰ کہ اسلامی ریاست میں ذمی یا غیر مسلم کو حرام اشیاء کی خرید وفروخت کرنے کی اجازت دی ہے۔ (۲)

تکثیری سماج اور شخصی آزادی:

اسلام نے لوگوں کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کو بھی منع فرمایا ہے۔ اس بارے میں ارشاد ربانی ہے۔

لَا تَدْخُلُوا بُيُوتاً غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا (۳)

''اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ ان سے اجازت نہ لے لو''۔

ایک اور ارشاد ہے:

---

(۱) البقرہ:۱۸۸

(۲) شامی، ابن عابدین شامی، ردالمختار علیٰ الدرالمختار شرح تنویر الابصار، کتاب البیوع، باب بیع الفاسد، مطبع زکریا دیوبند، سن اشاعت، ۱۴۱۷ھ ۱۹۹۶ء، ج:۷، ص:۲۴۲

(۳) النور:۲۷

وَلَا تَجَسَّسُوا(۱)

''اور کسی کا بھید نہ ٹٹولا کرو۔''

ان احکام کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی نجی زندگی میں مداخلت نہ کی جائے یہاں بھی مسلم وغیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ غیر مسلم کے گھر بلا اجازت داخل ہونا یا بلا وجہ اس کی عیب جوئی کے لیے اس کی ٹوہ میں رہنا اسے تکلیف پہنچانے والی حرکات ہیں۔ ذمی کو تکلیف پہنچانا ناجائز وحرام ہے۔ غزوہ خیبر کے موقع پر کسی یہودی نے حضورﷺ سے بعض افراد کی ان کے گھروں میں داخل ہونے کی شکایت کی تو آپ نے مسلمانوں کو اس حرکت سے منع فرمایا۔

تکثیری سماج اور عدل وانصاف:

انسانی معاشرے میں عدل وانصاف کا قیام اللہ تعالیٰ کو اس قدر محبوب ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور آسمانی کتابوں کے نزول کا ایک اہم مقصد نظام عدل کا قیام بتایا ہے۔ ارشاد ہے:

لَقَدُ أَرُسَلُنَا رُسُلَنَا بِالُبَيِّنَاتِ وَأَنزَلُنَا مَعَهُمُ الُكِتَابَ وَالُمِيُزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالُقِسُطِ (۲)

''ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر۔''

جہالت وبے دینی انسانی معاشرے میں ظلم وستم کا باعث ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رسولﷺ کو آسمانی تعلیمات دے کر اس لیے بھیجا تاکہ انسانیت راہ حق پر گامزن ہوکر عدل وانصاف کی خوگر بن جائے۔ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کے

(۱) الحجرات:۱۲

(۲) الحدید:۲۵

درمیان عدل وانصاف کا معاملہ چاہتا ہے۔جس کے متعلق ارشاد ہے۔

وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُواْ بِالْعَدْلِ (۱)

''اور جب تم لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔''

اسلامی تعلیمات میں مسلم و غیر مسلم سب انسانوں کے درمیان عدل و انصاف کا حکم ہے۔ قیام عدل میں کسی قوم کی دشمنی وعداوت سے متاثر ہونے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ تمام خواہشات و جذبات سے بالاتر ہوکر صرف اللہ کے لیے عدل وانصاف قائم کرنے کا حکم ہے۔ارشاد ربانی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِينَ لِلّهِ شُهَدَاء بِالْقِسْطِ وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلاَّ تَعْدِلُواْ اعْدِلُواْ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُواْ اللّهَ إِنَّ اللّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۲)

''اے ایمان والو! کھڑے ہوجایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی۔اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو۔عدل کرو یہی بات نزدیک ہے تقویٰ سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو۔''

دین اسلام کی یہ امتیازی شان ہے کہ کفار و مشرکین کی جانب سے اظہار نفرت وعداوت کے باوجود مسلمانوں کو راہ اعتدال سے سرمو ہٹنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ انہیں ہر حال میں نیکی اور تقویٰ پر قائم رہنے کی تاکید کرتا ہے۔کلام پاک میں ارشاد ہے:

وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَن صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ

---

(۱) النساء:۵۸

(۲) المائدہ:۸

الْحَرَامِ أَن تَعْتَدُواْ وَتَعَاوَنُواْ عَلَى الْبرِّ وَالتَّقْوَى وَلاَ تَعَاوَنُواْ عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُواْ اللّهَ إِنَّ اللّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۱)

''اور باعث نہ ہو تم کو کسی قوم کی دشمنی جو کہ تم کو روکتی تھی حرمت والی مسجد سے اس پر کہ زیادتی کرنے لگو اور آپس میں مدد کرو نیک کام پر اور نہ مدد کرو گناہ پر اور ڈرتے رہو اللہ سے بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے۔''

عدل وانصاف کے متعلق اللہ تعالیٰ نے حضورﷺ کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا ہے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّهُ وَلاَ تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيماً (۲)

''بے شک ہم نے اتاری تیری طرف کتاب سچی کہ تو انصاف کرے لوگوں میں جو کچھ سمجھا دے تجھ کو اللہ اور تو مت ہو دغا بازوں کی طرف سے جھگڑنے والا۔''

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ یہ آیت ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے ایک ذرہ چرائی تھی اور جب اندیشہ ہوا کہ چوری کھل جائے گی تو وہ ایک یہودی کے گھر پھینک دی۔ جب یہودی کے گھر میں ذرہ پائی گئی تو اس نے چوری سے انکار کیا اور اصل چور اس یہودی پر الزام دھرنے لگا اور مسلمانوں کی ایک جماعت نے یہودی کے مقابلے میں مسلمان کا ساتھ دیا۔ چنانچہ رسولﷺ بھی مسلمان کی طرف مائل ہونے لگے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو

(۱) المائدہ:۲
(۲) النساء:۱۰۵

اصل واقعہ کی اطلاع دی اور یہودی کو چوری سے بری قرار دیا۔ اوراس کے خلاف فیصلہ دینے سے روک دیا۔ (۱)

یعنی عدل وانصاف کے معاملے میں ایک یہودی کے مقابلے میں ایک مسلمان کی طرف ذرا سے میلان پر آپ ﷺ کو فوراً متنبہ کیا گیا اور بذریعہ وحی آپ ﷺ کو عدل پر قائم رہنے کا اہتمام کیا گیا۔

تکثیری سماج میں ادیان کا احترام:

اسلام رواداری اور برداشت سکھاتا ہے۔ مذہب وعقیدے میں تنگ نظری کا قائل نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

لَا إِكْرَاهَ فِيُ الدِّيُنِ (۲)

''دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔''

اسلام فی نفسہ محل اکراہ نہیں ہوسکتا جب اسلام ایسی چیز ہے جس کی خوبی یقیناً ثابت ہے سو جو شخص شیطان سے بداعتقاد ہو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اعتقاد ہو (یعنی اسلام قبول کرے) تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جس کو کسی طرح شکستگی نہیں ہوسکتی نیز آیت کا مقصود اسلام کی خوبی کا واضح اور ثابت بالدلیل ہونا ہے جس کو اس عنوانِ خاص سے بیان فرمایا گیا ہے۔ (۳)

---

(۱) ابن کثیر، امام ابی الفداء اسماعیل ابن کثیر القرشی الدمشقی، تفسیر ابن کثیر، مطبع دار الفکر سن اشاعت ۱۴۰۰ھ، ۱۹۸۰ء، ج:۱، ص:۵۵۲

(۲) البقرہ:۲۵۴

(۳) تھانوی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مکمل تفسیر بیان القرآن، جلد ا ص ۱۵۲، مطبع ادارہ تفسیر دیوبند، بدون سن۔ امام قرطبی نے اس آیت کے چھ مطالب تحریر فرمائے ہیں۔ (۱) یہ آیت منسوخ ہے یا ایھا النبی جاہد الکفار والمنافقین سے۔ (۲) یہ آیت خصوصاً اہل کتاب کے متعلق اور یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کو اسلام لانے پر مجبور کیا گیا۔ (۳) یہ ہے کہ یہ آیت انصار کے متعلق نازل ہوئی ہے جب ان کے بچوں کو یہودی بنانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ (۴) یہ آیت انصار کے ایک شخص سے متعلق نازل ہوئی ہے جسے ابوحصین کہا جاتا ہے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر......)

آیت کے اس ٹکڑے میں جس جبر واکراہ کی نفی کی گئی ہے اس سے مقصود جبر فطری کی نفی ہے۔یعنی اللہ نے ہدایت وضلالت کے معنی میں یہ طریقہ اختیار نہیں فرمایا ہے کہ وہ اپنی مشئیت وقدرت کے زور سے لوگوں کو ہدایت پر چلاوے یا گمراہی کی طرف ہانک دے۔اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہے۔لیکن یہ بات اس کی حکمت اور عدل کے خلاف ہے۔(۱)

اسی وجہ سے فقہاء اسلام نے مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کسی فرد کو زبردستی اسلام لانے پر آمادہ کیا اور وہ بجبر واکراہ مسلمان ہو گیا اور اس کے بعد پھر وہ کفر کی طرف لوٹ جاتا ہے تو فقہا کی صراحت یہ ہے کہ نہ اسے قتل کیا جائے گا اور نہ قید میں ڈالا جائے گا۔(۲)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاء فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاء فَلْيَكْفُرْ (۳)

''اور کہو سچی بات جو ہے تمہارے رب کی طرف سے، پھر جو کوئی چاہے مانے اور جو کوئی چاہے نہ مانے۔''

یعنی حق وہ ہے جس کو اللہ نے حق قرار دیا ہے اقتضائے خواہشات حق نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ یعنی قرآن یا اسلام حق ہے جو اللہ کی طرف سے آیا ہے

☆ گذشتہ صفحہ کا بقیہ حوالہ......(۵)معناها لاتقولوا لمن اسلم تحت السيف مجبراً مكراهً۔ (۶)یہ آیت اہل کتاب کے بڑے لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جب ان کو اہل کتاب ہونے پر مجبور کیا جار ہا تھا۔تفصیل کے لیے دیکھیے قرطبی ،ابی عبداللہ محمد ابن احمد الانصاری القرطبی ، الجامع الا حکام القرآن، مطبع داراحیاء التراث عربی، بیروت لبنان،سن اشاعت،۱۴۱۶ھ ۱۹۹۵ء، ج:۳،ص:۸۱-۲۸۰)

(۱) اصلاحی،امین احسن اصلاحی،تدبر قرآن، مطبع تاج پرنٹرس،نئی دہلی سن اشاعت ۱۹۸۹ء، ج:۱،ص:۵۹۲

(۲) کاسانی ،امام علاؤالدین ابی بکر سعود الکاسانی الحنفی ،(۵۸۷ھ)بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، مطبع دارلکتاب دیوبند، بدون سن، ج:۶،ص:۱۸۸)

(۳) الکہف:۲۹

اب جو (ایمان لانا) چاہے ایمان لائے جو (کافر رہنا چاہے وہ کافر رہے) یہ کلام وعیداً ہے ایمان و کفر دونوں کا اختیار دیا گیا ہے جو اپنے اندر ایک خاص تہدید رکھتا ہے۔ (۱)

ایک اور ارشاد ہے:

قُلِ اللّٰہَ أَعۡبُدُ مُخۡلِصاً لَّہٗ دِیۡنِی ۝ فَاعۡبُدُوا مَا شِئۡتُم مِّن دُونِہ (۲)

''تم کہو میں تو اللہ کو پوجتا ہوں خاص کر اپنی زندگی اس کے واسطے اب تم پوجو جس کو چاہو اس کے سوا۔''

ان آیات میں نبی ﷺ کی زبان سے نہایت واضح الفاظ میں اعلان برأت و بے تعلقی ہے کہ میں اس حکم کے مطابق جو مجھے میرے رب کی طرف سے ملا ہے اپنے رب کی ہی بندگی اور اسی کی بلا شرکت غیرے اطاعت کرتا ہوں اور اسی کی دعوت تم کو بھی دے رہا ہوں اگر تم میری یہ بات نہیں مانتے تو تم خدا کے سوا جس کی چاہو بندگی کرو میں تمہارے اس فعل سے بری ہوں۔ (۳)

حضور ﷺ کی بے انتہا خواہش تھی اور اس سلسلہ میں سعی بلیغ فرماتے تھے کہ سب لوگ اسلام میں داخل ہوں۔ لہٰذا ہر وقت متفکر و پریشان رہا کرتے تھے۔ اس پر ارشاد الٰہی ہوا:

---

(۱) گویا یہ عیینہ کی درخواست کا جواب ہے عیینہ نے کہا تھا ان لوگوں کے لباس اور بدن کی بدبو سے کیا آپ کو بو نہیں ہوتی ہم قبیلہ مضر کے شرفاء اور سردار لوگ ہیں ہم ان کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے ہیں اگر ہم مان لیں گے تو سارے لوگ ایمان لے آئیں گے۔ مناسب یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹا دیجیے تا کہ ہم (آپ کے پاس بیٹھ سکیں اور آپ کی بات سنیں اور) آپ پر ایمان لے آئیں اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی اللہ نے جواب میں غریب مسلمانوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کو بٹھا رکھنے کی نبی ﷺ کو ہدایت دی۔ مظہری، قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی حنفی مظہری مجددی نقشبندی، التفسیر المظہری، مطبع ندوۃ المصنفین، بدون سن، ج:۱، ص:۳۰

(۲) الزمر:۱۴، ۱۵

(۳) اصلاحی، امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، مطبع تاج پرنٹرس، نئی دہلی سن اشاعت ۱۹۸۹ء، ج:۶، ص:۵۷۴

وَلَوۡ شَاءَ اللّٰهُ مَا أَشۡرَكُواۡ وَمَا جَعَلۡنَاكَ عَلَيۡهِمۡ حَفِيۡظاً
وَمَا أَنتَ عَلَيۡهِم بِوَكِيۡلٍ (۱)

''اوراگراللہ چاہتا تو یہ لوگ شرک نہ کرتے۔ہم نے تم کوان پر کوئی محافظ (مقرر) نہیں کیا۔اور نہ تم ان کے وکیل ہو (کہ انہیں بھٹکنے نہ دو)۔''

آیت کا سیاق وسباق بتارہاہے کہ پیغمبر کی طرف التفات ہے مطلب یہ ہے کہ تم وحی الٰہی پر جمے رہواوراپنے موقف حق پر ڈٹے رہو۔اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اوران مشرکین کی مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کروان سے اعراض کرواور یہ بات یادرکھو کہ اللہ اپنے دین کے معاملہ میں جبر کو پسند کرتا ہوتا تو ان میں سے کوئی بھی شرک پر قائم نہ رہ سکتا وہ سب کو توحید اوراسلام کی صراط مستقیم پر چلا دیتا لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ وہ لوگوں کواس معاملہ میں اختیار دے کر آزمائے کہ کون توحید کی راہ اختیار کرتا ہے اورکون شرک کی۔ (۲)

اسی مضمون کی ایک اورآیت ہے:

وَلَوۡ شَاءَ رَبُّكَ لآمَنَ مَن فِيۡ الأَرۡضِ كُلُّهُمۡ جَمِيۡعاً
أَفَأَنتَ تُكۡرِهُ النَّاسَ (۳)

''اگرتمہارا رب چاہتا تو دنیا کے تمام لوگ سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا تم لوگوں کومجبور کرسکتے ہو۔''

یعنی اللہ کی خواہش یہ ہوتی کہ اس کی زمین میں صرف اطاعت گزار فرمانبردار ہی بسیں اور کفراورنافرمانی کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہوتواس کے لیے

---

(۱) الانعام:۱۰۷
(۲) اصلاحی،امین احسن اصلاحی،تدبرقرآن،مطبع تاج پرنٹرس،نئی دہلی سن اشاعت ۱۹۸۹ء،ج:۳،ص:۱۳۴
(۳) یونس:۹۹

نہ یہ مشکل ہے کہ وہ تمام اہل زمین کو مومن و مطیع پیدا کرتا اور نہ یہی مشکل ہے کہ سب کے دل اپنے ایک ہی تکوینی اشارے سے ایمان واطاعت کی طرف پھیر دیتا۔(۱)

کلام پاک میں غیر مسلموں کی الگ مذہبی حیثیت کو بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے:

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ o لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (۲)

''ان غیر مسلموں سے کہہ دو کہ تمہارے لیے تمہارا دین۔اور میرے لیے میرا دین۔''

یعنی میرا دین الگ اور تمہارا دین الگ میں تمہارے معبودوں کا پرستار نہیں اور تم میرے معبود کے پرستار نہیں میں تمہارے معبودوں کی بندگی نہیں کر سکتا اور تم میرے رب کی بندگی کے لے تیار نہیں اس لیے میرا اور تمہارا راستہ کبھی ایک نہیں ہوسکتا یہ کفار کو رواداری کا پیغام نہیں ہے بلکہ جب تک وہ کافر ہیں ان سے ہمیشہ کے لیے برائت بے زاری اور لاتعلقی کا اعلان ہے اور اس سے مقصود ان کو اس امر سے قطعی اور آخری طور پر مایوس کر دینا ہے کہ دین کے معاملہ میں اللہ کا رسول اور ایمان لانے والوں کا گروہ کبھی ان سے مصالحت نہ کریگا۔(۳)

(۱) اس کا مطلب یہ نہیں کہ نبی ﷺ لوگوں کو زبردستی مومن بنانا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ آپ کو ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔دراصل اس فقرے میں وہی انداز بیان اختیار کیا گیا ہے جو قرآن میں ہمیں بکثرت ملتا ہے کہ خطاب بظاہر نبی سے ہوتا ہے مگر اصل میں لوگوں کو وہ بات سنانی مقصود ہوتی ہے جو نبی کو خطاب کر کے فرمائی جاتی ہے۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، مطبع مرکزی جماعت اسلامی ہندنئی دہلی، سن اشاعت ۱۹۷۰ء، ج: ۲،ص:۳۱۳

(۲) الکافرون ۱-۴

(۳) اس آیت سے امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نے یہ استدلال کیا ہے کہ کافروں کے مذاہب مختلف ہوں لیکن بحیثیت کفر کے وہ ایک ہیں اس لیے یہودی، عیسائی کا اور عیسائی یہودی کا اسی طرح ایک مذہب کا کافر دوسرے مذہب کے کافر کا وارث ہوسکتا ہے۔بقیہ اگلے صفحہ پر..................

ان قرآنی آیات سے یہ بات خوب واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ردوقبول میں لوگوں کو آزاد رکھا ہے۔قتال کا مقصد لوگوں کو مسلمان بنانا نہیں بلکہ ان کی سرکشی وشرارت ختم کر کے انہیں مطیع و پرامن بنانا ہے۔اسلام کی دعوت رشد و ہدایت سب کے لیے عام ہے۔مگر اس معاملہ میں کسی پر جبر نہیں۔ اسلام کی بنیاد توحید پر قائم ہے اور اسی کی اشاعت وترویج کے لیے پورا نظام جہاد قائم ہوا ہے۔قرآن مجید نے شرک کو ظلم عظیم قرار دیا ہے۔اور دیوتاؤں اور مذہبی تقدس کی حامل اشیاء کو برا بھلا کہہ کر ان کی دل آزاری سے منع فرمایا ہے۔اس بارے میں ارشاد ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِن دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ (۱)

''اور تم لوگ برا نہ کہوان کو جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا۔پس وہ برا کہنے لگیں گے اللہ کو بے ادبی سے بدون سمجھے۔ اسی طرح ہم نے مزین کردیا ہے۔ ہر ایک فرقہ کی نظر میں ان کے اعمال کو۔''

اتفق العلماء على ان معنٰى الابه لاتسبو الهة الكفار فيسبوا الهكم فمنع الله تعالىٰ فى كتابه احدً ان يفعل فعلا جائزاً يودى الىٰ محظورٍ ، ولا جل هذا تعلق علماو نا بهذه الاية فى سدالذرائع وهو كل

☆ گذشتہ صفحہ کا بقیہ حوالہ......امام مالک ،امام اوزاعی ،امام احمد اس بات کے قائل ہیں کہ ایک مذہب کے پیرو دوسرے مذہب کے پیرو کی وراثت نہیں پاسکتے دونوں حضرات نے اپنے اپنے موقف کے اعتبار سے دلائل پیش کیے ہیں جو کتب فقہ میں موجود ہیں۔تفصیل وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔مودودی،سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن ،مطبع مرکزی جماعت اسلامی ہندنئی دہلی،سن اشاعت ۱۹۷۰ء، ج:۶،ص:۷-۵۰۹

(۱) الانعام:۱۰۸

عقد جائز فی الظاهر یؤول اویمکن ان یتوصل به الیٰ محظورٍ۔(۱)

غرض بتوں کو برا کہنا فی نفسہ امر مباح ہے مگر جب وہ ذریعہ بن جاوے ایک امر حرام یعنی گستاخی بجناب بارتعالیٰ کا تو وہ بھی منہی عنہ اور قبیح ہو جاوے گا۔(۲)

یہ نصیحت نبی ﷺ کے فرمابرداروں کو کی گئی ہے کہ وہ اپنی تبلیغ کے جوش میں اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ مناظرے اور بحث وتکرار سے معاملہ بڑھتے بڑھتے غیر مسلموں کے عقائد پر حملہ کرنے اور ان کے پیشواؤں اور معبودوں کو گالیاں دینے تک نوبت پہنچ جائے کیونکہ یہ چیز ان کو حق سے قریب لانے کے بجائے اور زیادہ دور پھینک دے گی۔(۳)

فقہاء نے اسی بنا پر اس اصل سے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ جو طاعت درجہ واجب میں نہ ہو اور کسی معصیت کا سبب بن جاتی ہو تو اس طاعت کو ترک کر دیا جائے گا۔(۴)

تکثیری سماج میں عبادت گاہوں کا احترام:

چنانچہ اسلام غیر مسلموں کی عبادتگاہوں کا احترام سکھاتا ہے۔اسلام میں قتال کی غرض محض شر پسند قوتوں کا شر ملیامیٹ کرنا ہے جن کے سبب مذہبی

---

(۱) ابن عربی ،ابوبکر محمد بن عبداللہ المعروف ابن عربی،احکام القرآن، مطبع البابی الحلبی سن اشاعت ۱۳۸۷ھ ۱۹۶۷ء، ج:۲،ص:۳۴-۷۳۵

(۲) تھانوی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مکمل تفسیر بیان القرآن، مطبع ادارہ تفسیر دیوبند، بدون سن، ج:۲، ص:۱۱۹

(۳) مودودی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، مطبع مرکزی جماعت اسلامی ہند نئی دہلی، سن اشاعت ۱۹۷۰ء، ج:۱،ص:۵۷۱

(۴) دریابادی، مولانا عبدالماجد دریابادی، تفسیر قرآن تفسیر ماجدی، مطبع لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس، سن اشاعت ۱۴۲۱ھ و مطابق ۲۰۰۰ء، ج:۲،ص:۸۳

مراسم کی ادائیگی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيراً (۱)

''اور اگر نہ ہوتا دور کرنا اللہ کا بعض کو بعض سے۔البتہ ڈھائے جاتے خلوت خانے درویشوں کے اور عبادت خانے نصاریٰ کے اور عبادت خانے یہود کے اور مساجد، کہ لیا جاتا ہے بیچ ان کے نام اللہ کا بہت۔''

کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ سب متعبدات اب بھی حق تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہیں۔اصل یہ ہے کہ اپنے اپنے زمانۂ مشروعیہ اور مقصودیت ملت میں ان کی مطلوبیت مقصود ہے۔(۲)

رسول ﷺ نے نجران کی عیسائی آبادی کو ذمی بنایا اور ان کو ہر طرح کی مذہبی آزادی دی بلکہ ان کے تحریری معاہدہ میں صراحت کی گئی کہ ان کے طریقۂ عبادت، ملی قوانین، مذہبی نظام، عہدوں اور اوقاف میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی جائے گی۔(۳)

اسی طرح جب بیت المقدس کے عیسائیوں کو حضرت عمرؓ نے جو تحریری

---

(۱) الحج:۴۰

(۲) تھانوی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مکمل تفسیر بیان القرآن، مطبع ادارہ تفسیر دیوبند، بدون سن۔، ج:۷، ص:۵۷، اصل میں صوامع بیع اور صلوات کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں صومعہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں راہب اور سنیاسی تارک دنیا اور فقیر رہتے ہوں بیعہ کا لفظ عربی زبان میں عیسائیوں کی عبادت گاہ کو کہتے ہیں، صلوات سے مراد یہودیوں کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے، مودودی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، مطبع مرکزی جماعت اسلامی ہندنئی دہلی، سن اشاعت ۱۹۷۰ء، ج:۳، ص:۲۳۳

(۳) ابوداؤد، سلیمان بن اشعث ابوداؤد سجستانی، سنن ابوداؤد، کتاب الخراج والفئ والامارۃ، باب اخذ الجزیہ۔اس کی تفصیل کے لیے احقر کا ایم فل کا مقالہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

امان لکھ کر دی تھی اس میں جان و مال اور مذہبی مقامات ورسوم، یہاں تک کہ صلیبوں تک کے تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی۔(۱)

خالد بن ولید نے شام کے مفتوح علاقے ''عانات'' کے لوگوں سے ان دفعات پر مصالحت کی تھی: ان کا کوئی عبادت خانہ اور کنیسہ نہیں ڈھایا جائے گا اور ان کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ دن رات جب چاہیں اپنے ناقوس بجائیں، سوائے نماز کے اوقات کے، اور اپنی عید کے دنوں میں انہیں صلیب کے جلوس نکالنے کا حق حاصل ہوگا۔(۲)

آخر میں یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام امن وسلامتی کا دین ہے، اس کی تعلیمات اس کے مزاج کی آئینہ دار ہیں، اسلام نے اس وقت امن، خیرخواہی اور رواداری کا سبق عام کیا جبکہ ہرطرف تاریکی، عدم برداشت اورنفرت پائی جاتی تھی، اسی طرح دین اسلام نے لسانی، مذہبی، علاقائی اور خاندانی بنیادوں پر کسی طبقۂ انسانی کوغلام بنانے، کسی کوادنیٰ یا کمتر خیال کرنے اور خود برتر سمجھنے کے احساس کو ہی معدوم کر دیا ہے۔گویا اسلام کا نظریہ تکثیریت بقائے باہم کے اصولوں پر مبنی ہے، اور ایک پرامن معاشرہ کی تشکیل کا خواہاں ہے۔جس میں تمام انسانی برادری پوری طرح آزادی سے رہ سکے۔

☆☆☆

---

(۱) طبری، ابوجعفر محمد بن جریر طبری، (۲۲۴-۳۱۰ھ) تاریخ الرسل والملوک، مطبع دارالمعارف، مصر سن اشاعت ۱۹۶۲ء، ج:۳، ص:۶۰۹

(۲) قاضی، ابویوسف، یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، مطبع، بیروت لبنان، دارالمعرفہ، بدون سن، ص:۱۷۵

کتابیات

۱۔ السہیلی، ابی القاسم، عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن احمد، الروض الانف فی شرح السیرۃ النبویۃ لابن ہشام، محمد عمر عبدالسلام السلمی، داراحیاء التراث عربی، بیروت ولبنان، ۲۰۰۲ء۔

۲۔ الھروی، علی بن سلطان محمد ابوالحسن نورالدین، الملا الھروی، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، دارالفکر۔

۳۔ محمد بن اسماعیل، الصحیح البخاری۔

۴۔ ابن حجر عسقلانی، ابوالفضل شہاب الدین احمد بن علی بن محمد الکنانی، فتح الباری، شرح صحیح البخاری، بیروت لبنان، ۱۳۷۹ھ۔

۵۔ شرح الزرقانی علی موطا امام مالکؒ۔

۶۔ حلبی، علی بن برھان الدین، السیرۃ الحلبیۃ، مکتبہ نور، ۱۴۰۰ھ۔

۷۔ اصفہانی، راغب حسن محمد بن المفضل، المحاضرات الادباء ومحاورات الشعراء والبلغاء، دارارقم بیروت، ۱۹۹۹ء۔

۸۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، ۱۹۷۰ء۔

۹۔ دریابادی، عبدالماجد (مولانا)، تفسیر قرآن تفسیر ماجدی، لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۰ء۔

۱۰۔ قرطبی، ابی عبداللہ محمد بن احمد الانصاری، الجامعہ الاحکام القرآن، بیروت لبنان، ۱۹۹۵ء۔

۱۱۔ جصاص، ابی بکر احمد بن علی الرازی، احکام القرآن، مصر، ۱۳۴۷ھ۔

۱۲۔ فتاویٰ عالمگیری، مکتبہ رحیمیہ دیوبند، بدون سن۔

۱۳۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، تاج پرنٹرس نئی دہلی، ۱۹۸۹ء۔

۱۴۔ قاضی، ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، بیروت لبنان۔

۱۵۔ شامی، ابن عابدین، ردالمختار علی الدرالمختار ،شرح تنویر الابصار، زکریا دیو بند، ۱۹۹۶ء۔

۱۶۔ موسوعہ فقیہ، کویت ۱۹۹۲ء۔

۱۷۔ ابن کثیر، ابی الفدا اء اسماعیل ابن کثیر القرشی الدمشقی، تفسیر القرآن العظیم، دارالفکر، ۱۹۸۰ء۔

۱۸۔ تھانوی، حکیم الامت اشرف علی، تھانوی، بیان القرآن، ادارہ تفسیر دیو بند۔

۱۹۔ ابن عربی، ابوبکر محمد بن عبداللہ، احکام القرآن، البابی الحلبی ، ۱۹۶۷ء۔

۲۰۔ ابوداوٗد، سلیمان بن اشعث ،سنن ابوداوٗد۔

۲۱۔ طبری، ابوجعفر محمد بن جریر، تاریخ الرسل والملوک، دارالمعارف مصر، ۱۹۶۲ء۔

۲۲۔ بلگرامی، غلام علی آزاد حسینی واسطی ،سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان تقدیم وتحقیق، محمد سعید الطرنجی، بیروت لبنان، ۲۰۱۵ء۔

۲۳۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن علیگ، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک۔

۲۴۔ ندوی، سید سلیمان (مولانا) عرب و ہند کے تعلقات، معارف پریس اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء۔

۲۵۔ محمد عمر، (ڈاکٹر) ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پراثر، پبلی کیشن ڈویژن علی گڑھ، ۱۹۷۵ء۔

۲۶۔ نظامی، خلیق احمد پروفیسر ،سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ،الجمعیۃ پریس، دہلی، ۱۹۵۸ء۔

۲۷۔ خلیق انجم، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، الجمعیۃ پریس دہلی، ۱۹۶۲ء
۲۸۔ بیرونی، ابوریحان محمد بن احمد، کتاب البیرونی فی تحقیق ماللہند، مترجم سید اصغر علی، الفصیل ناشران وتاجران کتب، ۲۰۰۵ء۔
۲۹۔ منشی محمد سعید احمد، مارھروی، امرائے ہنود، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن، ۱۹۳۶ء۔
۳۰۔ ندوی، سید سلیمان، (مولانا) مقالات شبلی، معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۹ء۔
۳۱۔ مسعودی، ابوالحسن بن حسین بن علی، مروج الذھب ومعادن الجوہر، مترجم پروفیسر کوکب شارانی، نفیس اکیڈمی، اسٹریچن روڈ کراچی، ۱۹۸۵ء۔
۳۲۔ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور، ۲۰۰۶ء۔
۳۳۔ شیخ محمد اکرام، رودِ کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور، ۲۰۰۵ء۔
۳۴۔ شیخ محمد اکرام، موج کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۲۰۰۳ء۔
۳۵۔ سید محمود (ڈاکٹر) متحدہ ہندوستانی قومیت، ادبی مرکز ہند پبلی کیشن بمبئی، بدون سن۔
۳۶۔ کامل قریشی، اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۸۷ء۔
۳۷۔ سید عابد حسین، (ڈاکٹر) قومی تہذیب کا مسئلہ، انجمن ترقی اردو نئی دہلی، ۱۹۵۵ء۔
۳۸۔ قرضاوی، یوسف، اسلام اور سیکولرزم، مترجم ساجد الرحمٰن، عالمی ادارہ فکر اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء۔

۳۹۔ وحیدالدین خاں،(مولانا)الرسالہ،۲۰۱۷ء۔

۴۰۔ مقالہ،محمد عبدالقیوم(حافظ) سیکولرزم اور مابعد سیکولرزم،(سیکولرزم کے بدلتے تصورات کا تعلیمات نبوی کی روشنی میں جائزہ) مجلّہ الاضواء، پاکستان۔

۴۱۔ ماہنامہ برہان دہلی،۱۹۶۲ء۔

۴۲۔ بستوی،اختر،(ڈاکٹر) سیکولرزم اوراردوشاعری،یوپی اردواکادمی،لکھنؤ، ۱۹۹۶ء۔

۴۳۔ انعام اللہ خاں،سیکولرزم جمہوریت اوراسلام،ادارہ شہادت حق دہلی، ۱۹۷۰ء۔

۴۴۔ سیدعابد حسین،ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں،مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی،۲۰۱۲ء۔

۴۵۔ مشیرالحق،مسلمان اورسیکولر ہندوستان،مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ،نئی دہلی، ۱۹۷۳ء۔

۴۶۔ کیرانوی،وحیدالزماں قاسمی(مولانا)القاموس الوحید،ادارہ اسلامیات لاہور،۲۰۰۱ء۔

۴۷۔ دہلوی،سیداحمد فرہنگ آصفیہ،مکتبہ حسن سہیل لمیٹیڈ اردو بازار،لاہور۔

48. Gellner,Nation and Nationalism

۴۹۔ طاہرہ نیر،(ڈاکٹر)اردوشاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار،۱۹۷۷ء تا۱۹۷۱ء،انجمن ترقی پاکستان گلشن اقبال کراچی،۱۹۹۹ء۔

۵۰۔ آزاد،ابوالکلام،(مولانا) اسلام اورنیشنلزم،البلاغ بک ایجنسی نمبر:۵،گولمنڈی لاہور،۱۹۲۹ء۔

۵۱۔ مجموعۂ لیکچرس۔
۵۲۔ حالی، الطاف حسین، حیات جاوید، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء۔
۵۳۔ مضمون، یکجہتی کی توسیع میں علماء دیوبند کا کردار، مضمون نگار: مولانا اجرار احمد قاسمی، ماہنامہ، دارالعلوم، ۲۰۱۷ء۔
۵۴۔ گیلانی، مظفر، مضامین مولانا گیلانی، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، ۱۹۸۴ء۔
۵۵۔ شاہ جہاں پوری، ابوسلمان، شیخ الہند مولانا محمود حسن، ایک سیاسی مطالعہ، زید بک ڈپو نئی دہلی، ۲۰۱۱ء۔
۵۶۔ مدنی، حسین احمد، (مولانا) و محمد میاں (مولانا) ہمارا ہندوستان اور اس کے فضائل، دفتر جمعیۃ دہلی، ۱۹۷۰ء۔
۵۷۔ نجیب آبادی، اکبر شاہ خاں، (مولانا) آئینۂ حقیقت نما، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۵۸ء۔
۵۸۔ فہمی، شوکت علی، (مفتی) ہندوستان پر اسلامی حکومت، بک پوائنٹ کراچی، ۲۰۰۵ء۔
۵۹۔ بھٹی، محمد اسحاق، برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۹۰ء۔
۶۰۔ شبلی نعمانی، اسلامی حکومت اور ہندوستان میں اس کا تمدنی اثر، الناظر پریس لکھنؤ، ۱۹۲۷ء۔
۶۱۔ ندوی، علی میاں (مولانا) ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ اور موجودہ صورتحال کی عکاسی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس لکھنؤ، ۱۹۹۲ء۔
۶۲۔ محمود علی، عہد وسطیٰ میں مشترکہ تمدن اور قومی یکجہتی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو

بازارنئی دہلی، ۱۹۹۶ء۔
۶۳۔ سر، سید احمد خاں، اسباب بغاوت ہند، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۰۳ء۔
۶۴۔ سید، محمد میاں، علماء ہند کا شاندار ماضی، الجمعیۃ پریس، ۱۹۹۶ء۔
۶۵۔ اکبرآبادی، سعید احمد، (مولانا) نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، بدون سن۔
۶۶۔ فرنگی عبدالحئی، (مولانا) مجموعہ فتاویٰ، یوسفی پریس فرنگی محل لکھنؤ، ۱۳۱۲ھ۔
۶۷۔ بریلوی، احمد رضا خاں، اعلام الاعلام بان ہندوستان دارالاسلام۔
۶۸۔ قاسمی، مجاہدالاسلام، مجلّہ فقہ اسلامی۔
۶۹۔ اعظمی، حبیب الرحمٰن، (مولانا) دارالاسلام اور دارالحرب، مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ مئو، ۲۰۰۲ء۔

☆☆☆

پس نوشت

خسرو فاؤنڈیشن: ایک نئی پہل

ہندوستان، جنت نشان جس نازک دور سے گزر رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہندوستان جو مذہبی، لسانی اور تہذیبی تکثیریت کا ملک ہے اور کثرت میں وحدت سے جس کی پہچان ہوتی ہے اور اس عظیم ملک کی تاریخ کا ہر دور انسان دوستی کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے، جس میں شکتی اور شانتی بھکتوں کے گیتوں کا نتیجہ ہے اور ہندوستان ہمیشہ اس بات کا گواہ رہا ہے کہ دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے۔

پتہ نہیں ہندوستان کو کس کی نظر لگ گئی کہ سماجی قربتیں، فاصلوں میں بدلنے لگیں ہیں۔ اس دیس کے باسیوں کی بڑی تعداد اگر چہ آج بھی اس عدم اتفاق اور تفریق کا حصہ بننے کو تیار نہیں لیکن غالب ترین اکثریت بھی اگر خاموش رہے تو وہ اس کے وجود کو عدم میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اب زیادہ تر لوگ اپنی ذات کے گرد طواف کر رہے ہیں۔ غم زمانہ کی جگہ درد تنہا سے دوچار ہیں اور وہ انسان جو کبھی ضمیرِ دشت و دریا تھا آج اسیرِ آشیانہ بنا ہوا ہے۔ زخموں کے تاجر، نفرتوں کے بیوپاری، دہشت و وحشت کے کاروباری ہندوستانی سماج کو اپنی دانست میں چھن بھن کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہا جا سکتا اور اس لئے ضروری ہے کہ ایک بار پھر ان تمام علامتوں کو زندہ کیا جائے جو ''محبتوں کی گاتھا'' اور ''پریم کے ڈھائی اکچھر'' سے لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رہے جن کے

نزدیک مادرِ وطن، وہاں پیدا اور بسنے والے، اس کے دریاؤں کا پانی پینے والے، اس کے کھیتوں میں پیدا ہونے والے رزق سے اپنی بھوک مٹانے والوں کو پھر اس بات کا احساس دلایا جائے کہ ان کا مذہب، زبان اور علاقہ کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن ماں اور ماٹی سے ان کا رشتہ اس دنیا کے پیدا کرنے والے اور چلانے والے رب کی مرضی کا نتیجہ ہے اور جس میں رب راضی اس میں سب راضی رہیں، تو ہی بہتری اور بھلائی ہے۔

ہندوستان میں ایک دوسرے کو جوڑنے والوں کا اگر ذکر کیا جائے تو ان کے نام اور کام گنانے میں کوئی دیر نہ لگے گی لیکن اگر ایک دوسرے کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والوں اور بانٹنے والوں کے نام کسی سے پوچھے جائیں تو اسے ان کے نام یاد کرنے اور بتانے میں بڑی مشکل آئے گی۔

اس سب کے باوجود آج پھر یہ دوریاں، یہ ٹکراؤ اور یہ تشدد بار بار کیوں دیکھنے کو مل رہا ہے؟ اس کا سیدھا سادھا جواب یہی ہے کہ ہم نے انہیں بھلا دیا ہے جنہیں ہمیں یاد رکھنا چاہیے۔ دیوی دیوتاؤں، پیغمبروں، پیروں اور رشیوں مُنیوں کے تیاگ، تپسّیا، سمرپن اور سیوا بھاؤ کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے سندیش اور اپدیش ایک دفعہ پھر لوگوں تک پہنچائے جائیں۔

یہی وہ سوچ اور فکرمندی ہے جس کے تحت **''خسرو فاؤنڈیشن''** کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ حضرت امیر خسرو ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی وہ محبوب، دلنواز اور ہمہ گیر شخصیت ہیں جنہیں صدیاں گزر جانے کے باوجود یاد رکھا گیا اور ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ وہ بیک وقت صوفی بھی تھے اور سپاہی بھی، وہ شاعر بھی تھے اور ماہرِ موسیقی بھی، وہ مؤرخ بھی تھے اور تاریخ ساز بھی۔ غرض ان کی شخصیت کی عبقریت نے ان کو گوں

نا گوں صفات کا حامل اور ہمہ جہت پہلوؤں سے اس طرح متصف کیا کہ عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ میں بڑے بڑے ناميوں کے نشان مٹ گئے لیکن جب سے آج تک نہ صرف ہماری تاریخ کے جز بلکہ انسانی ذہنوں میں زندہ وتابندہ ہیں۔ مسرت کے لمحے ہوں یا یاس وغم کی گھڑیاں، خسرو کا نام اور کلام ہمہ وقت اپنی جاذبیت اور آفاقیت کے اعتبار سے ہمارے ساتھ ہے۔

اس گتھی کو تو ماہرینِ نفسیات ہی سلجھا سکتے ہیں کہ خسرو نے کس طرح حال و قال، جنگ وجدل، سوز وساز، خانقاہ اور دربار کے درمیان توازن برقرار رکھا۔ یہ اس لیے بھی اہم ہیں کہ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ انہوں نے یہ توازن اپنی شخصیت کے کھرے پن کے ساتھ قائم کیا تھا۔ ان کی ہر وابستگی اور ہر رول کھلی کتاب کی طرح سب پر عیاں تھا اور اس کھلے پن کے تعلقات کے باوجود زندگی بھر کامیاب رہے۔ صدق بہ تدبّر کی مثالیں امیر خسرو کی شخصیت کو ہمارے لئے اور بھی آئیڈیل بناتی ہیں۔

اس ''ترک نژاد'' کی وطن دوستی نہ صرف مثالی، بلکہ قابلِ رشک بھی ہے۔ خسرو کے نزدیک یہ سرزمینِ ہند، عدن کی جنت، یہاں کے لوگ ہر رنگ میں انہیں عزیز، یہاں کے درباروں کے آگے ایران، توران، خراسان کے دربار ہیچ۔ یہاں کے لوگ ہر صنعت، علم وادب کی ہر شاخ، فنونِ لطیفہ کے ہر میدان اور عسکری تربیت کے ہر انداز میں ''بے نظیر'' اہلِ ہند کا توحیدی مسلک انہیں باوجود ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے عزیز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ وہ (یعنی اہلِ ہند) ہمارے جیسا دین نہیں رکھتے، مگر ان کے اکثر عقیدے ہمارے جیسے ہیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہندوستان، ہندوستان کی ہر روایت

چاہے وہ مذہبی ہو چاہے تہذیبی، ثقافتی ہو یا لسانی، علمی ہو یا ادبی، اس کو خسرو کی طرح دیکھیں، اپنائیں، اس پر صدقے اور واری جائیں۔ خسرو جن کی ماں ہندی اور باپ ترک تھے، ایسے ہندوستانی ہیں جو ہندوستان کی عظمت کے ترانے ہی نہیں گاتے بلکہ وہ اپنے آپ کو اس مٹی کا اس طرح حصہ بن جانا چاہتے ہیں جیسے یہ مٹی ہی سب کچھ ہو اور جس سے تعلق اور محبت کو الطاف حسین حالؔی نے یوں بیان کیا کہ:

تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

خسرو فاؤنڈیشن وطن دوستی، انسان دوستی، فطرت سے ہم آہنگی، ہر طرح کی تفریق چاہے وہ فرقہ وارانہ ہو یا جنسی سب سے اوپر اٹھ کر محبت کو عام کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے کہ بقول شیخ ابراہیم ذوقؔ:

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

(ممبران بورڈ آف ڈائریکٹرس)

پروفیسر اختر الواسع	روہت کھیڑا
سراج الدین قریشی	رنجن مکھرجی